راجندر سنگھ بیدی

دانہ و دام

نیا ادارہ ○ لاہور

اپنے مرحوم ماں، باپ کے نام

افسانے

بھولا	۹
ہمدوش	۲۵
من کی من میں	۳۵
گرم کوٹ	۵۱
چھوکری کی ٹوٹ	۶۷
پان شاپ	۸۱
منگل اشٹکا	۹۵
کوارنٹین	۱۱۱
تلاوان	۱۳۵

دس منٹ بارش میں	۱۳۹
حیاتین 'ب'	۱۵۱
لچھمن	۱۶۵
ردِ عمل	۱۷۹
موت کا راز	۱۹۵

پیش لفظ

'دانہ و دام' کی پہلی تقریظ اس جنگ کی ..... وہی عظیم قربانی ہے جو شاید کسی دوسرے کو اس کی مرہونِ منت نہیں۔ اس کے لئے میں صاحب تقریظ سے اظہارِ افسوس کرتا ہوں اور پڑھنے والوں سے ہمدردی۔

'دانہ و دام' میری پہلی چند کوششوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں فنکار قدرے نمایاں ہے۔ اوائل افسانہ میں ٹوسٹ (Twists) بالارادہ لائی گئی ہیں۔ پڑھنے والوں کے تجسس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایک فقرہ افسانے کے شروع میں آیا جسے بعد کی نقاطی اور منظر کشی میں عمداً گم کر دیا گیا اور بعد میں اسے دہرا کر نہ صرف ایک توازن قائم کیا گیا بلکہ خیالات کے تسلسل سے پڑھنے والے کے جمالیاتی ذوق کو آسودہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ماحول کی نگار عیب اور فن کی سرحدوں پر بھٹکتی رہی۔ بادۂ شوق کی بات کا یہ عالم ہوا کہ لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر

گرہن، اور اس کے بعد کے افسانوں میں ایسا نہ ہوا۔ بقول میر ؎

خاک میں مل کے میر ہم سمجھے ۔۔۔ بے ادائی تھی آسماں کی ادا

لیکن بعد کے افسانوں میں اس قسم کا خلوص اور شدت تاثر نہ ہوا۔ گرہن کوٹ میں مقام اوج ایک سے زیادہ سہی لیکن یہ فنی خامی بذات خود کسی فنی خوبی سے کم نہ ہوئی اور کسی نقاد نے کہانی کی عظمت سے انکار نہیں کیا بلکہ اسے فنی طور پر درست کہانیوں پر فوق حاصل ہوا۔ کہانی کا کوئی معین کلیہ نہیں۔ یہ زمین ہر صاحب طبع کا اجارہ ہے۔ ہمیں ہر تجربہ کی اجازت ہے۔ کیونکہ اس میں عمل سے زیادہ نتیجہ کو دیکھنا ہوتا ہے۔ کوئی قلم برداشتہ لکھ دیتا ہے تو کوئی چیخوف کے قول کے مطابق "اس طرح آہستہ آہستہ لکھتا ہے جیسے کہ مریض بھنا ہوا تیتر کھاتا ہے ۔۔۔ ہولے ہولے اور سوچ سوچ کر ۔۔۔" یعنی اگر حاصل عمل درست ہے تو سب کچھ درست ہے۔

پروگرام رشید صدیقی صاحب نے اپنے ایک گرامی نامہ میں "دانہ دام" کے بعد کی کہانیوں کے متعلق لکھا ۔۔۔ "آپ ہر دو کو کل سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ یہ آپ کی شخصی فتحمندی ہے لیکن یہاں پہنچ کر ایسا نہ ہو کہ جرو ہی مقصد بن جائے جیسا ہمارے اگلے شعراء کا وطیرہ تھا۔ میں فن کے کمال کا اتنا قائل نہیں جتنا کہ فنکار کے کمال کا ..... مثال کے طور پر سمجھ لیجئے کہ میں شاعری کا اتنا قائل نہیں جتنا کہ غالب یا اقبال کا ....."

"دانہ و دام" کے افسانے لکھتے ہوئے مجھے فنی کمال حاصل نہیں تھا لیکن فنکار بدرجہ اتم زندہ تھا۔ اب جبکہ آہستہ آہستہ فن پر قدرے عبور حاصل ہو رہا ہے تو فنکار موت اور زیست کے درمیان معلق ہے اور اس حیاتیاتی کشمکش کا نتیجہ معلوم؟

۱۵ جون ۱۹۴۳ء ۔۔۔ راجندر سنگھ بیدی

بھولا

میں نے بابا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور رکھنے کے لئے بابا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنوئیں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً بابا کے کسی عزیز کی آمد کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد بابا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لئے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جا کر انہیں راکھی باندھتی ہیں۔ مگر بابا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لئے خود ہی آجایا کرتا تھا اور راکھی بندھوا لیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے، اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔

ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ گنا چوستے ہوئے اس نے کہا:

"بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا ــــــ؟"

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا اور اس کی آواز بہت سُریلی تھی جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سپیدی، گلاب کی سُرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منہ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ تاہم میں نے زبردستی اس کے سُرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"بھولے ــــــ تیرے ماموں جی.... تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟"

بھولے نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا "ماموں جی!"

بابا نے اسٹور تر پڑھنا چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ بابا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتی تھی۔ میں نے بارہا بابا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروا نہ کرنے کے لئے کہا تھا مگر بابا نے از خود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔

بابا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہر، ہری ہر، ہری ہر، ہری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

پھر اس نے اپنے لعل کو پیار سے بلاتے ہوئے کہا:

"بھولے ـــــ تم ننھی کے کیا ہوتے ہیں؟"

"بھائی!" بھولے نے جواب دیا۔

"اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں۔"

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے باباجی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سننے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھ میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا، جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس میر بوجھ کے نیچے گردن پچکنے لگی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا۔ ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لئے آواز دی۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا، اور اسے سینکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا:

"مجھ بوڑھے کی اتنی پروا نہ کیا کرو بیٹا"

——— بھولا ابھی تک نہ سویا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا:

"بابا جی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟"

"نہیں بیٹا" ——— میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا: "میں آج بہت تھک گیا ہوں ——— کل دوپہر کو تمہیں سناؤں گا۔"

بھولے نے رُوٹھتے ہوئے جواب دیا: "میں تمہارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتا جی کا بھولا ہوں۔"

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سُننے کا عادی تھا کہ "بھولا بابا جی کا ہے اور ماتا جی کا نہیں۔" مگر اس دن بھولے کو کندھے پر اُٹھا کر چھ میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید میں اتنا نہ تھکتا۔ اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا۔ اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اُٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدھم سا ہونے لگا ——— میں اُونگھتے اُونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہوگا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود

میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا:

"میں نہیں آؤں گا ـــــ تیرے پاس بابا!"

"کیوں بھولے؟"

"بھولا بابا جی کا نہیں ـــ بھولا ماما جی کا ہے۔"

میں نے بھولے کو مٹھائی کے لالچ سے منا لیا اور چند ہی لمحات میں بھولا بابا جی کا بن گیا اور میری گود میں آ گیا۔ اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ بابا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنوئیں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹاس کو دھو ڈالا۔ اب بابا نے اپنے بھائی کے لئے سیر کے قریب مکھن تیار کر لیا تھا۔ میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبہ پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا: عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، خاوند، بچے، سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے، بابا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا:

"بابا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا ـــــ؟"

"کس بات کا ـــ بیٹا؟"

"تمہیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔"

"ہاں بیٹا ـــــ!" میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہوگا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ باباجی کے کہانی سُنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر وہ باباجی یا ماتاجی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا کھلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے کہانی سُننے کے چاؤ لے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سی جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنوئیں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لئے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے، پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا، بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خود غرضی پر مبنی تھا تاہم میرے خیال میں آیا ——

"آخر بابا کا بیٹا ہی ہے نا —— اللہ اس کی عمر دراز کرے۔"

میں نے پٹواری سے کہا کہ تم خانقاہ والے کنوئیں کو چلو اور میں تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جس طرح گزشتہ شب کو آسمان کے ایک کونے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ بابا نے کہا:

"بابا جی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ـــــ خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا ـــــ آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔"

"اوں ہوں" میں نے زیرِ لب کہا "پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا۔"

بابا خاموش ہو گئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے کہا "بابا میری کہانی ـــــ میری کہانی ـــــ"

"بھولے ـــــ میرے بچے" میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا "دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"

"راستہ بھول جاتے ہیں؟" بھولے نے سوچتے ہوئے کہا "بابا تم جھوٹ بولتے ہو ـــــ میں بابا جی کا بھولا نہیں بنتا۔"

اب جبکہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا اور پندرہ بیس منٹ استراحت کے لئے نکال سکتا تھا۔ بھلا بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے سلائے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبتی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید بامشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا:

"اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے ـــــ تو اس کے تم ذمہ دار ہو۔"

ـــــ اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا۔ جس کے آخر میں شہزادہ اور

شہزادی کی شادی ہو جائے مگر میں نے اس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ ایک افسردہ سا منہ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنوئیں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رخ نہ کر لے میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں رہتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گویا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ٹرنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"چل ماموں جی کے دیس ——— رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس۔
ماموں جی کے دیس، ہاں ہاں! ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے.....؟"

جونہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا:

"بابا ——— آج ماموں جان آئیں گے نا ———؟"

"پھر کیا ہوگا بھولے ———؟" میں نے پوچھا

"ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلو رکتا لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر مکئی کے بھٹوں کا ڈھیر ہوگا نا بابا ——— ہمارے یہاں تو مکئی ہوتی ہی نہیں بابا۔ اور تو اور..... ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی؟"

میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے "خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی" کے الفاظ

سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔
"جیتا رہے" میں نے دعا دیتے ہوئے کہا "بہت ذہین لڑکا ہوگا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔"

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تاکہ ماموں جی کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔ دیئوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا، دیئوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجہ میں ماتا نے کہا:

"بابا جی ـــــ بھیا ابھی تک نہیں آئے"

"کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔"

"ممکن ہے کوئی ضروری کام آپڑا ہو ـــــ راکھی کے روپے ڈاک میں بھیج دیں گے ـــــ"

"مگر راکھی؟"

"ہاں راکھی کی کہو..... انہیں اب تک تو آجانا چاہیئے تھا۔"

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجہ میں کہا: "ماتا جی ـــــ ماموں جی کیوں نہیں آئے؟"

ماتا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا: "شاید صبح کو آجائیں ـــــ تیرے ماموں جی ـــــ میرے بھولے!"

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا،

"میرے ماموں جی تمہارے کیا ہوتے ہیں؟"

صبو تم ننھی کے ہو"

"بھائی؟"

"تم جانو ــــ"

"اور منی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں ــــ"

"بھائی بھی نہیں؟"

"نہیں ــــ"

ــــ اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آ گیا جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا ہر ہاتھ ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور ہاتھ کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

"مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے" میں نے دل میں کہا۔ "اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لئے تو آ جانا چاہیئے تھا۔" میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکایک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔

دودھ کا کٹورا لئے کھڑی تھی۔

"میں نے کتنی بار کہا ہے ——— تم میرے لئے اتنی تکلیف نہ کیا کرو ———" میں نے کہا۔

دودھ پینے کے بعد فرطِ شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں بابا کو یہی دعا دے سکتا تھا تاکہ وہ سہاگ دیتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا مگر اس خیال کے آنے سے کہ اس کا سہاگ تو برس ہوئے لٹ گیا تھا میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا:

"بیٹی ——— تمہیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔"

پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا ننھی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے کہا:

"بابا ——— ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"آجائیں گے ——— بیٹا۔ سو جاؤ۔ وہ صبح سویرے آجائیں گے۔"

اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لئے اس قدر بیتاب دیکھ کر بابا بھی کچھ بیتاب سی ہو گئی۔ عین اس طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔

بابا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے بابا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام لڑکوں کی سی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹہ تک سو لیتا۔ پھر وہ گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے

لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے بابا کو سو جانے کے لئے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

"بتی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو ——— میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں" ——— میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلہ پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے ننھے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں اور اسی لئے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ بابا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونہ کونہ چھانا۔ بھولا کہیں نہ تھا ———!

"بابا ——— ہم لٹ گئے" میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اسی سے پوچھے۔ اپنے سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہو گئیں۔ بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔

میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر

گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں کہ کسی وقت کا دیا کام آجائے۔ منتیں مانیں کہ بھولا مل جائے۔ وہی اندھیرے گھر کا اُجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اسی کی آس سے ہم اُڑے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ تھے۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ مایا بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے۔ مٹھیاں کھچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے ایک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں سچ کہتا ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے میں جورو کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے ایشور کو بڑا بھلا کہا کہ ان دکھوں کے دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آگئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا: میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں۔ اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا:

"مایا بیٹی ——— دیکھو! مجھے یوں تمہارا خراب مت کرو ——— حوصلہ کرو۔ بچے اغوا ہوتے ہیں مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔ باز بگڑ بچوں کو مارنے کے لئے نہیں ملے

جاتے۔ پال کر بڑا کر کے کسی کام میں لانے کے لئے لے جاتے ہیں ـــــ بھولا مل جائے گا۔"

ماں کے لئے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا۔ گویا میں اس وجہ سے چُپ ہو گیا ہوں کہ مجھے مایا کے مقابلہ میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر "نہیں" ـــــ میں نے کہا "آدمی کو ضرور کچھ حوصلہ دکھانا چاہئے۔"

اس وقت آدھی رات اِدھر تھی اور آدھی اُدھر جب ہمارا پڑوسی اس حادثہ کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لئے جو گاؤں سے دس کوس دُور شہر میں تھا روانہ ہوا۔

باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ تاکہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔ اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو پانی پوچھا، خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارک باد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا:

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر شب کی تاریکی میں میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکایک مجھے ایک جانب سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوفناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے

اس کے اس وقت وہاں ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا ـــــــ کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سُنائی تھی ۔ اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سُنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں ۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمہ دار ہو گے نا ـــــ!!"

ہمدوش

سطحی نظر سے تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ مرکزی شفاخانے کے ان لوگوں کو جن کی نگرانی میں بہت سے نا امید و پُر امید مریض رہتے ہیں، مساوات پر بہت یقین ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو بلا امتیاز مذہب و ملت تیس تیس گز کے کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کھلے کھلے بازوؤں والی قمیص پہنا دیتے ہیں۔ جن سے ایک خاص قسم کی سوندھی سوندھی نامانوس سی بُو آتی ہے۔ قمیص گھٹنے سے بھی کچھ گز اونچی ہوتی ہے۔ بعض وقت اتنی اونچی کہ ازار بند بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔ مرکزی شفاخانے اور مرکزی زندان خانے کے مکینوں کی پوشش میں فرق جی کیا ہے؟ یہی! کہ شفاخانے کے مکینوں کی پوشش قدرے مٹیالی رنگت کی مگر اُجلی ہوتی ہے۔ لیکن زندان خانے میں بسنے والے بدنصیبوں کو شاید جی کبھی دھوبی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

شفاخانے میں ان تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیصوں میں ڈھکے ہوئے بدن بھی ایک ہی ساخت کے ہوتے ہیں جسمانی لحاظ سے کوئی قدرے فربہ یا کوئی بہت لاغر ہو تو ہو لیکن منہ پر ایک ہی سی زردی چھائی ہوتی ہے۔ ایک ہی خوف یا اندیشہ ہوتا ہے جو ہر ایک کے دل میں اضطراب پیدا کیا کرتا ہے۔

"کیا ہم موت کے اس غار سے زندہ سلامت گذر جائیں گے؟"

——— اور یہی سوچ ان غریبوں پر راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے۔

سورج ڈوبنے کو ہے۔ شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر بیٹھے کی مادہ اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آتی ہے اور اسی وقت انہی تیس تیس گرہ کے کھلے پائنچوں اور ڈھیلی ڈھالی قمیصوں میں بے رنگ و روپ چہروں والے لوگ حکم امتناعی کے باوجود شفاخانے کے احاطے کی مرمت طلب دیوار پر زندہ دستی کا نظارہ کرنے آتے ہیں اور گھنٹوں حسرت کے عالم میں اس متحرک زندگی کا تماشا کرتے ہیں۔

شفاخانے کے سامنے ایک بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا ہے ان کی رنگا رنگ ساڑھیوں کے پلّے بے باکانہ طور پر سر سے اُڑ رہے ہیں۔ کوئی 'ہمانی' کی خریدار ہے، کوئی 'نزہت' کی اور کوئی 'کوئی' کی ..... دوکان کے اُوپر، چھت پر پروفیسر کی بیوی چق کے پیچھے اپنے لبوں پر سے لپ سٹک کی اُڑی ہوئی سُرخی کو درست کرتی ہوئی دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہے۔

میرا حاتمی عظیم الدین کھیڑا مغلی ——— کھیڑا مغل کا رہنے والا ہے۔ مغل، پروفیسر کی حسین بیوی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اپنے کا رنگل بلکہ وجود تک کے احساس سے

بے نیاز ہو کر کہتا ہے:

"کیا اس کے لبوں پر سے سُرخی اڑ گئی تھی؟"

"دیکھتے نہیں..... ابھی پروفیسر کے کمرے سے باہر آ رہی ہے..... اور....."

"ہش ش..... ہش"— اور ہمارا دوسرا ساتھی اشچرج لال پھر ہمیں فنا کے عالم میں لے آتا ہے۔

سڑک پر ایک سبز اوپل کار پورے زور سے ہارن بجاتی ہوئی گذرتی ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے دو بوڑھوں کی نگاہیں تانگہ میں جاتی ہوئی دلہن کی سُرخ چوڑیوں میں پیوست ہیں اور دلہن کی نگاہیں سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جم رہی ہیں۔

چند ایک اوباش چھوکرے اپنے مخصوص بے پروایانہ انداز سے پٹے گاتے ہوئے سینما کی طرف لپکے جا رہے ہیں اور ان سے کچھ ہٹ کر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے ایک سادھو جاتا ہیں۔ جن کا ایک ایک قدم شانتی کے تجسس میں اٹھتا ہے وہ شانتی اور سکون جو کہیں نہیں ملتا..... شفاخانے کے پھاٹک پر دو خوانچہ والے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ وہ دونوں بیک ساعت دروازے کے عین بیچ میں اپنا خوانچہ رکھنا چاہتے ہیں..... کمزور نے پیچھے ہٹ کر تنومند کو ایک پتھر مارا ہے.....

"ارے او بے صبر و قناعت لوگو! صحت کی اس تھوڑی سی خوشی سے جو تمہیں عاریتاً دی گئی ہے کیوں مستفیض نہیں ہوتے؟ ارے دیکھتے نہیں۔ ہم تمہارے بھائی کتنے حرماں نصیب ہیں؟"

"ہاں بھائی!— یہ سب تندرستی کی باتیں ہیں" اشچرج لال کہتا ہے۔

"شاید ہم بھی تندرست ہو کر ایسا ہی کریں۔"

پھر کھیلا مغلی اس قبرستان کی طرف جو شفاخانے کے قریب واقع ہے، دیکھ کر چونک اٹھتا ہے اور کہتا ہے.....

"کل ہمارے ہی کمرے میں..... ساتویں چارپائی..... اف! میرا سر گھوم رہا ہے۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے وہ قبرستان ہماری طرف آ رہا ہے....."

"ہش..... ش ش....." میں اسے خاموش ہو جانے کے لئے کہتا ہوں "ایسی بات نہ کہو بھائی۔"

لیکن یہ مغلی کے بس کی بات نہیں۔ وہ زور سے چھینکتا ہے۔ کارنگل کے ساتھ اسے الفلوائینزا نے بھی آ دبایا ہے۔ اس کے بالکل زرد، بے رونق چہرے پر سرخ لوکدار رقیق لعاب سے بھری ہوئی ناک ایک عجیب، کریہہ منظر پیدا کر رہی ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں تندرستی کی دلچسپ حماقتیں محو کر ہی لیتی ہیں۔ حتےٰ کہ پھر مغلی ایک خوفناک انداز سے چھینکتا ہے اور بہت سے آبی، لعابی ذرات دھوپ کی گرد میں اڑنے لگتے ہیں۔ چھینکنے سے مغلی کی بڑھ کی ہڈی پر زور پڑتا ہے اور وہ درد کے ایک شدید احساس سے کارنگل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ جوں جوں درد کم ہوتا ہے اس کی مڑی ہوئی آنکھیں اور ہمارے رکے ہوئے سانس آہستہ آہستہ واپس آتے ہیں۔ کچھ دم لینے کے بعد مغلی کہتا ہے:

"بھائی..... کیا ہم ان چوڑے والیوں، ان خوانچہ والوں..... مزدوروں کے ہمدوش چل سکیں گے؟"

"تم جی میلا نہ کرو مغلی۔ ہیں..... میرا خیال ہے کہ تم بالکل تندرست ہو جاؤ گے

انچرج لال پہلے ہی روبصحت ہے لیکن میں ان لوگوں کے شانہ بشانہ کبھی نہیں چل سکوں گا، دیکھتے نہیں میری ٹانگ کو وہ بالکل گل ہی گئی ہے ..... کاش! میں اس گدا گر کے دوش بدوش چل سکوں مغلی ..... مجھے اس بات کی پروا نہیں۔ چاہے اس کی طرح میری بھی ایک ٹانگ کاٹ لی جائے ..... میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ صحت کی حالت میں اس احاطہ کی دیوار کو پھاند سکوں ....."

——— اور یوں ان تندرست انسانوں کے ہمدوش چلنے کی ایک زبردست خواہش کو پالنے ہر سے ہم اپنے اپنے کمروں کا رخ کرتے ہیں اور تودے کی مادہ جو کہ مٹی کے ایک ڈھیر پر بیٹھی ہمارے چلے جانے کا بڑی ہی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ پھر اسی مرمت طلب دیوار پر اپنے انڈوں کے خول بنانے کے لئے چونا کریدنے آتی ہے۔

سب پرندہ پرواز کے لئے پر تولتا ہے اور پنجے کا پچھلا حصہ زمین پر سے اٹھا کر نشست پرواز کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ اسے صورت ناہض کہتے ہیں۔ بیمار کے لئے صورت ناہض بیٹھنا معیوب اور بدشگونی کی علامت گنا جاتا ہے۔ ہاں! جو اس دنیا میں سے ایڑیاں اٹھا کر فضائے عدم میں پرواز کرنا چاہے، وہ بیمار بلا خوف صورت ناہض بیٹھے۔

کھڑا مغلی اسی طرح بیٹھا تھا۔ میں نے اسے یوں بیٹھنے سے منع کیا۔ اور ہمیں دروازے سے "گرٹی" آتے دکھائی دی۔

گرٹی ہماری نرس تھی۔ اس کا پورا نام مس گرٹرڈ بینسن MISS GERTRUDE BENSON تھا۔ ہم میں سے چند ایک دیرینہ مریض اس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اسے اس کے عیسائی نام سے بلانے سے ذرا بھر بھی تامل نہیں کرتے تھے اور یہ چھوٹی سی رعایت

گرٹی نے خود دے رکھی تھی، وہ مجھ پر عموماً اور کھیڑا مغلی پر خصوصاً مہربان تھی۔ مغلی کی اُجڈ گنوار حرکتیں گرٹی کے لئے باعث تفریح تھیں۔ سُرخ کمبل کو ایک طرف سرکاتے ہوئے وہ اکثر مغلی کے پاس بیٹھ جاتی اور اس کے ہلکی تراش کے بالوں میں اپنی خوبصورت انگلیاں پھیرا کرتی۔

جتنا وہ مغلی کو پیار کرتی اتنا ہی اسے وہم ہو جاتا کہ وہ ملاقی سے بعید ہے۔ وہ کہتا:

"وہ محض میری دلجوئی کے لئے مجھ سے پیار کرتی ہے..... مریض کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنا ان کے پیشے کی خصوصیت ہے اور پھر گرٹی میں جذبۂ رحم بھی تو بہت ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دن بہت قریب ہیں اور پھر اس چہرے پر رُوکھا پھیکا تبسم بھی رقص نہ کرے گا"

"گرٹی!..... گرٹی....." ہم دونوں نے پکارا

شفاخانے میں چند ایک مریض ایسے بھی تھے جنہیں کھانا گھر سے منگوا لینے کی اجازت تھی۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے نہیں تھے۔ ہمیں شفاخانے کی طرف سے بیماروں کی خاص خوراک ملتی تھی..... وہ خوش نصیب جب کھانا کھا کر چینی کے برتن دور رکھ دیتے اور ان میں سالن کی زردی اور روغن کی چکناہٹ دکھائی دیتی تو ہمارا دل ہمیں بغاوت کے لئے اکساتا۔

گرٹی کے ہاتھ سے ہم نے کھانا چھینا۔ وہی روزمرہ کا کھانا۔ اگر بھوک نہ ہوتی تو اس کے کھانے سے ہمیں رتی بھر بھی رغبت نہیں رہی تھی۔ بہت سے دُور دور میں تھوڑا سا ماگو رانہ تیرتا ہوا دکھائی دیتا جیسے برسات کے پانی میں مینڈک کے سینکڑوں انڈے چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں کی صورت میں ایک جھلی میں لپٹے ہوئے تیرتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے قحط زدہ لوگوں کے مخصوص انداز سے ایک ہی رکابی میں کھانا شروع کر دیا اور گرٹی کے کہے کی مطلق پروا نہ کی۔ مریضوں کی تیمارداری کے لئے آئے ہوئے لوگ ہمیں گھورنے لگے۔

"ایک سکھ اور ایک مسلمان..... ساتھ ساتھ نہیں، ایک ہی رکابی میں!"

— وہ کیا جانیں کہ شفاخانے کے احاطے کی چار دیواری سے باہر سب کچھ ہے مگر یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، سکھ ہے نہ عیسائی، گوڑ برہمن اور نہ اچھوت..... یہاں ایک ہی مذہب کے آدمی ہیں جنہیں بیمار کہتے ہیں اور جن کی نجات شفا ہے جس کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام خواہشات اور رہی سہی قوت صرف کر ڈالتے ہیں۔

اس دن شام کو ہم نے پھر تندرست انسانوں کی دلچسپ حماقتوں کا تماشا کیا۔ وہی ہنگامے، وہی بے صبری..... سامنے ایک ڈبل فلائی راٹی خیمہ کے نیچے چند ایک آدمی دعوت اُڑا رہے تھے۔ ایک کونے میں چند بوتلیں کھلی پڑی تھیں۔ کبھی کبھی سوڈے کی "بز" کی آواز آتی..... وہ لوگ ہنستے تھے، چلاتے تھے۔ کیلے اور سنگتروں کے چھلکے ایک دوسرے پر پھینک کر مشانہ بازی کی مشق کرتے تھے اور اس دعوت کی تمام رونق قبرستان کے بے رونق پس منظر کی وجہ سے زیادہ بارونق دکھائی دے رہی تھی۔ بیشک! زندگی کی بہت سی خوشیاں موت کے پس منظر کی رہینِ منت ہیں۔ جس طرح ماہِ شب کی درخشندگی رات کی سیاہی اور آسمان کے نیلے پن کی۔

کھیڑا منلی نے یک بیک صورتِ ناہض سے اٹھ کر ایک کانپتا ہوا پرجوش ہاتھ میرے شانے پر رکھا اور مشکوک انداز سے بولا:

"بھائی..... کیا ہم ان لوگوں کے ہمدوش بھی ہو سکیں گے؟"

میں کچھ دیر مبہوت کھڑا آسمان پر اُڑتی ہوئی چڈیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مغلی سے لپٹتے ہوئے کہا: "ہاں..... مغلی کیوں نہیں! لیکن تم اس طرح مت بیٹھا کرو۔"

پھر کچھ رُک رُک کر میں نے کہا:

"کل میری ٹانگ کا اپریشن ہے..... گرٹی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید آج یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو۔ تم ان لوگوں کے دوش بدوش چل سکو گے..... اشچرج بھی شفا پا جائے گا..... لیکن میں....."

اور ہم دونوں چپ چاپ نمناک آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر کھیڑا مغلی نے ایک خوفناک چھینک لی۔

دوسرے دن میری ٹانگ کاٹ لی گئی۔

پانچویں دن میری آنکھ کھلی۔ میں ہل جُل نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کھیڑا مغلی میری پائنتی پر بیٹھا زیرِ لب کچھ ورد کر رہا تھا۔ میری آنکھیں کھلتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ میں نے اپنے بدن میں کچھ طاقت محسوس کرتے ہوئے اس سے لپٹنے کے لئے کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں اپنی ٹانگ کے دُکھ جانے سے بلبلا اُٹھا اور مغلی اپنے کارنگل پر زور پڑنے سے!

مغلی کا کارنگل اچھا ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میں شفا پا کر ہسپتال سے چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں میری رفیقِ زندگی فوت ہو چکی تھی۔ اب ایک شیشم کی سخت سی دوہری لاٹھی میری رفیقِ زندگی بن گئی تھی۔ پہلی اور اس رفیقِ زندگی میں فرق صرف اتنا تھا کہ وہ مجھے اپنی باتونی طبیعت سے نالاں رکھتی اور یہ اپنی خاموشی سے نالاں تر۔

اُسی لاٹھی کو بغل میں دبائے میں آہستہ آہستہ کام پر چلا جاتا۔ مجھے اپنی ٹانگ کے کٹ جانے کا چنداں افسوس نہ تھا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ تندرست نہ ہو گیا اور اپنی خواہش کے مطابق شفاخانے کے احاطے کی دیوار سے باہر۔

ایک دفعہ میں شفاخانے کے پاس سے گذرا تو میری روح تک لرز گئی۔ اس وقت میرے ساتھی اور بعد میں آئے ہوئے مریض حسرت بھری نگاہوں سے ہماری دلچسپ حماقتیں دیکھنے میں محو تھے . . . . . اور احاطے کی مرمت طلب دیوار پر تین مولے اپنی تین کاٹے کی دموں کو تھرا رہے تھے۔ میرے خیال میں بڑا والا چھوٹے مولوں کی ماں تھی جو بیماری کے ایام میں اُسی دیوار پر اپنے انڈوں سے خول بنانے کے لیے چونا کریدنے آیا کرتی تھی۔

اُس وقت میرے سوا اُن مریضوں کی تکلیف کو کون جان سکتا تھا۔ میرے سوا اُن لوگوں کی مصیبت پر چند ایک آنسو بہائے . . . . مجھے سامنے بساطی کی دوکان پر چند نوجوان لڑکیوں کا جمگھٹا دکھائی دیا۔ اُن کی ساڑھیوں کے پلے اُسی طرح سے باکستان پر اُڑ رہے تھے . . . . . اور چھت پر چتی کے پیچھے پروفیسر کی بیوی اپنی ساڑھی کی سلوٹوں کو درست کرتی ہوئی دھندلی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں ایک مبہم سے احساس کے ساتھ بساطی کی دوکان کی طرف بڑھا اور وہاں سے کچھ نگلا ریشمی فیتے لاٹھی کو سجانے کے لیے خریدے اور کچھ غیر مطمئن کھویا کھویا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس لوٹا۔

ایک دن میں شفاخانے کے اندر گیا۔ تو میں نے دیکھا مغلی کا کاو بھی بہت حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہاں! اپشرج کی حالت نازک اور ناقابلِ بیان تھی۔ . . . (۱۰)

سکے لیے مجھے اپنے ایک افسر کے ساتھ چند ہفتوں کے لیے باہر جانا پڑا۔

میرے دل میں کئی بار خیال آیا۔ کھیڑا مغلی مجھے کتنا کوستا ہوگا۔ وہ تو پہلے ہی کہا کرتا تھا کہ انسان خود سکھی ہو کر اپنے گذشتہ دکھ اور دوسروں کی تکالیف کو عمداً بھول جایا کرتا ہے۔ ہر چند یہ بات درست تھی۔ مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے مجھ پر عائد نہ ہوتی تھی۔

واپس آنے پر فرصت کے ایک دن میں شفاخانے گیا۔

گرٹی نے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ میں ڈر سے سہم گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اشیرج لال دو دن ہوئے مکمل شفا پا کر اجمیر چلا گیا ہے۔ مگر گرٹی نے کھیڑا مغلی کی بابت کچھ نہ کہا۔

میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف گیا۔ برآمدے کے نیچے شفاخانے کے ملازم چند ایک عورتوں اور بچوں کو بلند آواز سے رونے سے منع کر رہے تھے۔ اُن عورتوں میں سے ایک کھیڑا مغلی کی ضعیف العمر اور نیم مردہ ماں تھی۔ جو اپنے بیٹے کی دائمی مفارقت کے غم میں فلک شگاف چیخیں مار رہی تھی۔ . . . پھر اُس کی بیوی . . . بچے . . . .

برآمدے کے ایک طرف مغلی موت کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اُسے یوں دیکھ کر میرے دل میں سے لاکھ گر پڑی . . . میں رو بھی نہ سکا۔

لوگوں نے چپکے سے مغلی کی میت کو اٹھایا۔ اُسے کندھوں کے برابر کیا اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے لے چلے!

مَن کی مَن میں

مادھو کی بیوی کو لوگ کلکارنی پکارتے تھے۔ اگر میں کچھ زیادہ نہیں بھولتا تو یہ نام کُلتارنی سے ہی بگڑ کر بنا تھا۔ مطلب کُل کی (دُر دیتی ہوتی) نیا کو پار لگانے والی۔ یہ پیار اور دُلار کا نام نہ صرف کُل کو اوج لگانے والی سے اختلاف ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ اس کا کچھ اور بھی گہرا مطلب ہے۔ جسے مادھو کے سوا کوئی کم ہی جان سکتا ہے۔ عین اس طرح جیسے موسیقی سے فضا میں تموّج کے علاوہ ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جسے کچھ دل ہی سمجھ سکتا ہے اور پھر چوٹ کھایا ہوا دل!....

سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ہوتے ہی کچھ گورکھ دھندا سے ہیں۔ معلوم نہیں لوگ کیوں بعض وقت جنم کے اندھے کو کیول سُکھ اور پیٹ گنوار کو دریا ساگر کہہ دیتے ہیں۔

کئی دفعہ کوئی بھولا بھالا بچہ اچانک اپنی ماں سے سوال کر دیتا ہے کہ میں

اس دنیا میں کہاں سے آیا تو ماں گھبرا کر جواب دیتی ہے۔ بیٹا! نرالی پورنما کے روز اندر بھگوان نے بہت سا مینہ برسایا۔ اس وقت بہت سے بچے آکاش سے گرے تھے ان میں سے ایک تم تھے۔ مجھے بہت من موہنے لگے اور میں نے تمہیں صحن میں سے اٹھا لیا۔ یا کہتی ہے تمہارا باپ ایک موہیالیس گھنٹوں والا جال لے کر رام تلائی یا شاہ طور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا۔ صرف جو تمہیں ایک تھا سا بیڈ کر عمر و جولا ہے کہ گھر کے سامنے روئی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا ہوا برسات کی خوشی میں گا رہا تھا۔ وہ تمہیں تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔ کچھ ایسی ہی بات ہم نے مادھو کے متعلق بھی سنی تھی کہ وہ چکنی مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا ——— اور ہری ہریا میں طغیانی آنے پر مٹی کے ایک ڈھیلے نے رام تلائی کے مندر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو چھوا۔ مٹی پانی اور ہوا تو پہلے ہی موجود تھے۔ آکاش اور آگ ملی تو بچہ بن گیا اور یہ سب کچھ ٹھاکر جی کی دیا سے ہوا ——— گلاب گڑھ کے تمام پرائمری پاس یا ٹھ فیل آدمی اس بات کو مانتے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ علاوہ اس بات کا جواب تو دیں کہ سیتا جی کس طرح کھیت میں دبائے ہوئے ایک گھڑے کو ہل کی ٹھوکر لگ جانے سے پیدا ہو گئیں؟ کرن جی کس طرح کنتی جی کے کانوں کی بالی سے بن گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے بیٹے کش کو کشا لینی گھاس سے کیسے بنا لیا گیا؟

خواہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا۔ پھر بھی اسے مٹی کا مادھو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ اگر گھر کے آدمی اسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا کرتے۔ گھر والی جو گڑا ..... گھر والوں کو بھی شکایت تھی فاکہ

مادھو گھر کا کام کاج کرنے کی بجائے دوسروں کا کام کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق۔ وہ قد کا گٹھیلا تھا اور جسم کا اکہرا عمر کوئی چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ چہرے پر چیچک کے داغ گورے رنگ سے گھی کھچڑی ہو رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھیں تو رسیلی تھیں ہی۔ مگر مادھو کی زیادہ دور تک مار کرتی تھیں۔ قدرے باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ . . . اتنی ابھری ہوئی کہ سوتے میں دزفتہ کی طرح ہمیشہ نیم باز رہتیں۔ کہا جاتا ہے کہ گوٹھ کے پرائمری سکول کے منشی بھائی گریب داس جو کبھی کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ ٹرک ہی فلم کے نظارے سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔ مادھو کی آنکھوں کو پیاسی کی آس مارتی آنکھیں کہا کرتے تھے اور اُن کے ہونہار شاگرد اپنے اُستاد کے ارشاد پر تضمین کرتے۔ یا یا کل تجدید کرتے ہوئے مادھو کو عمر کا ڈرنیا کہتے تھے۔

کلکارنی زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تاریک پہلو کو دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں ایک دلچسپ مگر خطرناک فطری تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر اُن کی آپس میں ایک آدھ جھپٹ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی فتوطیت اس درجہ نمایاں تھی کہ یہ کوئی اُسے بازار میں ملتا تو بجائے جے رام جی کی یا صاحب سلامت کے کہتا۔

"کہو بھئی مادھو ـــ من کی من میں رہی؟"

فنا کا نمائندہ اور فتوطیت کا علمبردار نی الفور ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا۔

"ہاں . . . بھائی ـــ من کی من میں رہی!"

اور اس قسم کا طریقۂ تخاطب کلکارنی کو سر سے پاؤں تک جلا دیتا۔ کیا کرتی؟

گلاب گڑھ کے لوگ، تو اُس کی شادی سے پہلے ہی مادھو کو اس کی باس پسندی کی وجہ سے یوں خطاب کرنے کے عادی تھے انہیں روکنا اُس پودے کو موڑنے کے برابر تھا جو ایک خاصا تن آور درخت بن چکا ہو۔ بہرحال وہ بہت ہی جھلاتی اور جو کوئی مادھو کو یوں خطاب کرتا۔ اگلے روز اُس کی بیوی، ماں یا بہن سے کلکارنی کی لڑائی ہوتی، اور کلکارنی جواب طلب کرتی "آخر اس من کی من میں رہی کا مطلب کیا؟"

مادھو کلکارنی کے اس احتجاج پر بہت خوش ہوتا۔ دفعی بجاتا اور کہتا۔

"میری زندگی کلکارنی کو کتنی پیاری ہے۔ کسی کو من کی من میں رہی کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالانکہ نہ اُسے ہنسلی بنوا کر دی ہے اور نہ پازیب . . . . ارے تین مہینے سے تو پیٹ رہی ہے۔"

ایک دن میں نے مادھو کو بیک بیک فلسفی بنتے دیکھا۔ منشی گربھ داس کے سامنے وہ عورت کی محبت و مروت کو سراہ رہا تھا ـــ کنگرو کی فلاح سے زیادہ عجیب، اُجڈ اور بھیانک انداز میں . . . اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ کلکارنی کی طرف ہے۔ اُس کے لفظ تھے۔

"بھائی گربھ داس . . . . اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔ عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے۔"

کتنا حقیقت سے لبریز تھا۔ مادھو کا عملی فلسفہ۔ ابھی لاکھوں کی ایک سُن کر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو کہے۔ کیا وہ خود مٹی کا مادھو نہیں ہے؟

بُرج والے کنوئیں کی بیڑ، جھرکل، ڈھول یا لٹھ ٹوٹتی ٹوٹتے جائے گی۔ مگر مادھو

اُس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوڑی سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر کم سے کم چارہ ڈال کر اُس کے مزارع دو دو سو کے بیلوں کی جوگ کو ایسی نامارہ بنا دیں گے کہ کلو شاہ کے بھرے میلے میں اُن کی قیمت پچاس پچاس روپے سے کوڑی نہ بڑھے گی۔ گھر میں کسی خوشی یا غم کے موقع پر ادھو سے کسی قسم کی توقع بے کار ہوگی۔ مگر وہ دوسروں کی مدد کے لیے کتنی جلدی لنگر لنگوٹا کسے گا۔ . . . گلاب گڑھ میں ایک بیوہ اجبو رہتی تھی۔ اُس کے خاوند رُلیا کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔ اُسی روز سے بے چاری اپنی عزت کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اگر اُسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بیچاری کبھی کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ مادھو کو اُس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح کے بہتان لگانے لگے طرح طرح کی باتیں بنا کر معصوم مادھو اور بدنصیب بیوہ کو بدنام کرتے۔ سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو وہ خود دینے سے ہچکچاتی ہے۔ اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔ اجبو کی مدد پر لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اور اس مخالفت میں کلکارنی سب کی پیشوائی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ سماج کے دائرہ میں رہ کر ایسی شکستہ حال بیوہ کے رہے سہے گوشت پوشت کو نوچ نوچ کر کھانا کوئی پاپ نہیں!

ایک دن مادھو کہیں باہر سے آیا۔ وہ چہرے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے بیس روپے دو گی ـــــ کارنی؟" مادھو نے گاڑھے کی چادر کو شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے اتنے روپوں کو؟"

مادھو کو اسی سوال کی توقع تھی۔ کمار جی کو اس بات کا وہم رہتا تھا کہ مادھو اپنی سخاوت پسند طبیعت کی وجہ سے جاڑے پیسہ خرچ کرتا رہتا ہے اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپ کھایا سو کھایا جو کھلایا سو گنوایا۔ وہ روپیہ جمع بھی کرتی تو اس لیے کہ زندگی میں کبھی کام آئے گا گویا وہ ہمیشہ جیتی رہے گی ـــــ اپنی بھی آس ـــــ اور شرادھ میں گئے گذروں کے نام پر وہ بہت سا روپیہ دان بھی کرتی۔ مگر اس قسم کے دان سے مادھو متفق نہیں تھا۔

"کیا کرو گے ان روپوں کو؟" اس سوال کا جواب مادھو نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔ فوراً بولا۔

"چندر ہی ہوتے تو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لیے کہہ رہی تھی ... میں باہر جا رہا ہوں۔ بنوا لاؤں گا۔"

کھکارنی اچھل پڑی۔ بھلا ہنسلی اور پازیب کے لیے کوان بیس روپے نہ دے گا۔ وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی بانسلی اٹھا لائی اور بیس کے پچیس روپے مادھو کی کمر میں بندھوا کر بولی۔

"سنو کل سنکرانت ہے ... مگر سنکرانت تمہارے بھوجن کا پہلا تیوہار ہوگا۔ پہلے تو سنار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آنا ... پل کی پل پہن لوں گی۔ جلدی آنا میں نے تیوہار منانے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی بانسلی پر ایک چست سی صدری ڈالی اور چل دیا۔ سنکرانت بھی آ گئی۔ اس دن سورج دھن راشی سے نکل کر مکر راشی میں داخل ہوتا ہے

اس لیے اسے مکر سنکرانت کہتے ہیں۔ سنکرانت کی دیوی نے سوائے مادھو کے پاپ کے گلاب گڑھ تو کیا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلا اور آنشوں تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سچی دھجی طور پر تل، گڑ، بیر، امرود اور گنڈیریاں بانٹ رہی تھیں۔ پریم کے اس تبادلے کو "اُدی پھرن" کہتے ہیں۔ ادی پھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری زندگی میں ایک روح پھونک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔ دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو"

چونکہ مادھو کے ہونے کا پہلا تہوار تھا۔ دونوں کو صحن کے وسط میں ایک دھوتی اور ایک لنگوٹی بندھوا کر بٹھا دیا گیا۔ جسم پر تیل اور دہی ملا گیا۔ اس کے بعد ہو کی بہن نے ہو کو اور دولہا کی بہن نے دولہا کو سہیلے گاتے ہوئے نہلایا۔ کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چمڑے پر انے سے ناؤں اور نفیریاں بجائیں۔ دف پر چوٹ پڑی، کلکارنی نے سہیلہ ورنا مصری اور ناریل بانٹا۔ اس وقت مادھو کا بدھائی لینے کے لیے وہاں ہونا لازمی تھا۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کلکارنی کو تو اپنی ہتھیلی اور پازیب کی پڑی تھی۔ وہ رہ رہ کر مادھو کو کوستی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو ساڑھی کے پلوؤں سے چھپاتی۔۔ کلکارنی جان گئی کہ سنار نے ہنسلی بناتے ہوئے دیر لگا دی ہوگی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا۔ شاید مادھو میری زیادتیوں کی وجہ سے مجھ سے روٹھ گیا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سنکرانت کے دن روٹھے منائے جاتے ہیں۔ مگر سیدھا سادا مادھو اتنے چھل بل کہاں جان سکتا تھا۔۔۔ سنار کے پاس آدمی دوڑایا گیا تو پتہ چلا کہ مادھو وہاں

پہنچا ہی نہیں۔

مادھو کی ڈھنڈیا پڑی۔ کوئی بچہ تھوڑے ہی تھا کہ راستہ بھول جاتا۔ کلکارنی کی تشویش بڑھی۔ اُس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔ اِس میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کی طرف کلکارنی سی ہوشیار عورت کو موہ نپ رکھا تھا۔ مگر وہ اتنا بے مہر نہیں تھا کہ اپنے ہو بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگن منانے سے احتراز کرتا۔

شام تک مادھو نہ پہنچا کلکارنی کی ہنسلی اور پازیب۔ کلکارنی کا غصہ اور فکر دونوں سُرعت سے بڑھنے لگے۔

جب شام کو دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ پہلے شور و غوغا سے آشنا کان برابر کی خاموشی کو پا کر شائیں شائیں کرنے لگے۔ اس وقت کلکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔ اس کا پڑوسی بنجارہ کہہ رہا تھا۔۔

"کہو بھائی۔ ۔ ۔ ۔ مادھو من کی من میں رہی؟"

جواب میں ایک مردہ سی آواز آئی "ہاں بھائی! من کی من رہی!"

اب تک تو کلکارنی کا فکر اُس کے غصہ پر غالب تھا۔ لیکن مادھو کو بے آنچ پہنچے اور پھر برس کے برس، دن، من کی من میں رہی کے الفاظ کہتے سُن کر اس کا غصہ فکر پر غالب آگیا۔ وہ سر سے پاؤں تک راکھ ہی تو ہو گئی۔ بجلی کی مانند لپکی۔ صحن میں آئی ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دی۔ ننگی اٹریوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اٹھا۔ اس اثنا میں مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ پوہ ماگھ کی سردی جگر تک پہنچتی ہے۔ کانپتے ہوئے مادھو نے کلکارنی سے دروازہ کھولنے کے لیے منت کی۔

اندر سے آواز آئی "جاؤ ــــ باہر ہی رہو۔ اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے؟ جدھر منہ اٹھائے ہو اُدھر چلے جاؤ ــــ اُترہے تو اُتر کو، دکھن ہے تو دکھن کو۔۔ گھر کیا ہے ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔ بڑے سونٹھ کی جڑ تلاش کرنے گئے تھے۔۔۔ اتنا بھی نہیں سوچا گھر میں خوشی ہے۔۔۔ پریشر نے چاہا تو یہ من کی من میں رہے گی۔۔۔ داویلا کیوں کرتے ہو"

مادھو کچھ دیر کے لیے ٹھٹک گیا۔ پھر بولا "دروازہ تو کھولو ــــ کارنی، دیکھو بڑی کے مارے اکڑ رہا ہوں۔ تمہاری ہنسلی، اور پازیب ہی بنوانے گیا تھا"

"میں جانتی ہوں سنار کے پاس تو تمہاری پرچھائیں تک نہیں پھٹکی۔۔۔ سچ سچ کہو کیا تم اُس میری سوت کے پاس نہیں گئے تھے؟"

"کون سوت؟"

"امبو ــــ اور میری سوت کون ہو گی؟"

حقیقت میں مادھو اسی کے پاس گیا تھا۔ کلکارنی کے سامنے اس بات سے انکار کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ اور وہ انکار کرتا بھی کیوں؟ ــــ بولا ــــ

"ٹھیک ہے کارنی ــــ امبو بہن نے کہلا بھیجا تھا۔ جا ہو کار نے ایک ایک روپے کے دو اور دو دو کے تین تین بنا لیے ہیں۔۔۔ اور میں نے بیس روپے تم سے دراصل اسی لیے مانگے تھے۔ تمہاری ہنسلی میں اپنے پیسوں سے بنوا دوں گا۔ جوڑا گھر میں جمع ہیں۔ فکر نہ کرو۔ دروازہ تو کھولو"

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔ کلکارنی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"برس دن کے بعد ایک آدھ دن خوشی کا آتا ہے۔۔۔ اُس میں بھی دُکھ ہی ملتا ہے۔۔۔ بہو بیٹے کا تہوار روز روز نہ آئے گا نا۔۔۔ سہیلے روز روز گائے جائیں گے۔۔۔

ایسے موقع پر خوشی کو دبا کر کون دتی مول لے . . . . یہ ہیں کہ . . ."

مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے تو مدن اور رتی کے سیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے!"

کلکارنی نے دروازہ نہ کھولا . . . .

مگر اُسے نیند کہاں آتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اُس نے آہستہ سے کواڑ کھولے تو دیکھا۔ اس کا مجازی مُنڈا دروازہ کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر اُونگھ گیا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے لگ رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شرمندگی کے ایک گہرے احساس سے اُس نے مادھو کا شانہ ہلایا۔ بولی۔

"میں کہتی ہوں . . ."

". . . ."

میں کہتی ہوں . . . چلو گے؟ اندر . . ."

مادھو نے آنکھیں ملتے ہوئے سر اٹھایا۔ اور بولا "ہاں . . . چلوں گا!"

مادھو اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ سردی میں ہاتھ سُن ہو رہے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ اُس کے اپنے نہیں ہیں۔ کلکارنی نے جلدی سے انگیٹھی جلائی مادھو کے اکڑے ہوئے جسم کو گرم کیا اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی — اور یہ رونا دھونا کاہے کا . . . مادھو کو تو ذرا بھی غصہ نہیں تھا!

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس ہوا۔ باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کراہتا رہا۔ کلکارنی نے گھی گرم کر کے جائفل کوٹ کر مالش بھی کی۔ مگر مادھو کا دُکھ

بڑھتا گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ دور نزدیک سے سیانے لائے گئے۔ مادھو کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اُس کے دونوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ کادنی کہتی تھی کہ نمونیا وغیرہ کچھ نہیں۔ امبو بہت گنڈے تعویذ جانتی ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے دیا ہوگا۔ اگر وہ گزشتہ شب کے واقعہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا قصور مان لیتی تو وہ دیوی سے کم کیا ہوتی۔ مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

دوپہر کے قریب کچھ افاقہ ہوا۔ اُس نے کادنی کو بلایا اور بولا۔

"میں نے سُنا ہے . . . کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا۔ صبح جب وہ میری خبر لینے کے لیے آئی تھی . . . کیوں؟"

"نہ جانے کیوں"

"تم جانتی ہو میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں . . ."

"ہاں . . . مگر میں بھی ہنسائی نہیں چاہتی۔ تمام دنیا میرے پیچھے کتے لگائے گی . . . جانتے بھی ہو دنیا کو . . . ؟"

"جانے دو دنیا کو" مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد کی ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اب جب کہ میں مر رہا ہوں۔ مجھے دنیا کی پروا ہی کیا ہے . . . میرے پاس تو اتنے بول بھی نہیں کہ میں امبو بہن اور اس کے ساتھ اپنے رشتے کی پاکیزگی کا دعویٰ کر سکوں . . . ہائے . . . تم اپنے مرتے ہوئے پتی کو یہ دو کہ تم اپنی زندگی میں اُس غریب کی ایسے ہی خبر گیری کرتی رہو گی . . . اُسے اپنے پاس بلا لو گی . . . کہو نا . . ."

"تیری خبر گیری کون کرے گا؟ . . . تمہارے دشمنوں کو . . ." کادنی زار و قطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف اُنگلی اٹھائی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ مگر کارنی دُنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اُس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لیے بھی اثبات میں سر نہ ہلایا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح تڑپ رہا۔ جس کے دل میں بہت سی خواہشیں ہوں۔ مگر موت اُس کا گلا آ دبائے۔ . . . کچھ دیر بعد مادھو کا درد ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد مرحوم کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر یاد آتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ تھی "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے!"

ہمارے ملک میں تہوار ہی تہوار تو ہیں اور ہوئی کیا؟ کاش یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا! بیوائیں اور یتیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار مکر سنکرانت آگئی۔ پھر سورج دھن راسی سے مکر راسی میں داخل ہوا۔ سنکرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے پاپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لیے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں کو پھیلا اور زنبول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوٹی بھرن کرتے ہوئے دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی "بیٹھا بیٹھا کھاؤ اور لیٹا لیٹا بولو۔"

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مناتی۔ ایک رُلیا اور مادھو کے رُوٹھ جانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ اُس سے روٹھ گیا تھا۔ ہائے رُلیا اور مادھو ایسے روٹھنے والے کوئی

ماننے کے لیے تھوڑے ہی رو ٹھے تھے!

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لیپ پوت یوں کیا گیا جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اُٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا عجب جو کہیں گھومتا پھرتا رُلیا ہی آجائے۔ نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے!

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکارنی اور اس کی بہو اور بیٹا خاص طور پر اُس کی شکل دیکھنے سے بیزار ہیں۔ کیونکہ اُسی نے تو مادھو کو جنتر منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اُس نے ایک کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، بیر اور گنڈیریاں وغیرہ رکھیں تاکہ مادھو کی بہو کو دے۔ اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے ایک پلّو سے اُس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر کی طرف چل دی۔

امبو کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ ہوتی تھی، آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"لو بہن ـــــ وہ رہی تمہاری سوت"

کلکارنی اُسے دیکھ کر جل بھُن گئی۔ آہستہ سے بولی "مرتی بھی نہیں کمبخت ..... مرے تو میں آٹے میں لوبان اور گھی ریندھوں ... دُودھ کا کٹورا پیوں ... گنگا نہاؤں نہ جانے کیا کیا کروں"

جب امبو بالکل نزدیک آگئی تو کلکارنی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے

مزین کرتی ہوئی بولی۔

"آؤ بہن!۔۔۔ بیٹھا بیٹھا کھاؤ اور بیٹھا بیٹھا بولو!"

امبو نے اُن دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سن لی تھیں۔ سوت کا لفظ کان میں پڑتے ہی اُس کا تمام جسم کانپنے لگا۔ بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا "بتیا کہاں ہیں؟"

دوسری عورتیں مسکرانے لگیں۔

پچھلے سال ٹھیک اسی دن، ادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسلا گیا۔ کلکارنی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے بھی پچھلی سنکرانت یاد آگئی۔ ٹھیک اسی دن امبو نے ادھو کا کلیجہ نکال لیا تھا۔ مگر وہ اُس سنکرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی۔ صرف اُسے ادھو کے وہ الفاظ یاد تھے "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے ہیلے نہ گائے جاتے ہیں۔ نہ گائے جائیں گے!"

تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر اوٹی بھرن کیا گیا۔ سہاگنوں نے ایک دوسری کی مانگ میں سیندور لگایا۔ جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے۔ رام رام!۔۔۔ کلکارنی نے امبو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر دالان سے باہر کر دیا۔ بولی:

"دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟"

امبو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اُس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر سب کی نظریں اُسی کی طرف تھیں۔ امبو نے منہ چھپا کر رونا چاہا۔ مگر وہ رو بھی تو نہ سکتی تھی۔ برس کا برس دن اور رونا! کلکارنی جان ہی تو نکال لے گی! مگر رونا برس کے برس

روز اور عام دن میں کوئی بھی تمیز نہیں کرتا۔ وہ آپ ہی آپ آجاتا ہے۔ بلکہ یتیم اور بیوہ کو تو بارہ کے بیس دن ہی تو آتا ہے۔ اسی دن مرے ہوئے بالکل نزدیک آجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اٹھتے ہیں ـــــ ساتھ ہی بیٹھتے ہیں، ہنسو تو ہنستے ہیں۔ روؤ تو روتے ہیں اور گلے مل مل کر روتے ہیں۔ کوئی انہیں دیکھتا ہے کوئی نہیں دیکھتا!

پڑوس کی بھارن امبو کے پاس سے گزری اور محض امبو کو سنانے کی غرض سے گنگنانے لگی ـــــ "پتی برتا کا ایک ہے دوجا بھارن کے دوئے!"

ـــــ اور پھر سنگھانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی... "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سما جائے۔ اس گومگو کی حالت میں کلکارنی نے اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ محض دنیا سے چھٹی ہوئی تھی اور ماہو کے آخری الفاظ کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے "نہ جانے امبو کہاں چلی گئی؟"

سماج کے ماتھے سے اس کلنک کے ٹیکے کو کلکارنی نے ہی تو دھویا تھا۔ لوگ اس سے خوش تھے اور جب وہ بہت خوش ہو کر عقیدت سے کہتے "بھئی کلکارنی نے اپنے نام کی لاج رکھ لی" تو سوکھا سا منہ بنا کر بھائی گریب داس ایک ٹھنڈا سانس لیتا اور کہتا:

"ـــــ آہ! گریب ماہو کے من کی من ہی میں رہی!"

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے۔ معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دوکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوا لینا چاہیئے۔ ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے سے گزرنے یا اپنے محکمہ کی تفریحی کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (WORSTED) پر سے نظر پھسلتی ہے تو تانیا نہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگتا ہوں۔ یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لئے مجھ سے تنخواہ لے کر کل کو اپنی ہمت ہی

ضروریات ترک کرنا پڑتی ہیں اور انہیں جگہ تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لئے خود مرتا جھٹا پہننا پڑتا ہے..... یہ گرم کوٹ میں نے پارسال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سینکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے پیچھے مرانجا، مرانجا اینڈ کو کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا۔ مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار ——— اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آتے ہوئے میں ارادتاً انارکلی میں سے گذرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا، دال، ایندھن بجلی، بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا..... جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گذرنا معیوب نہیں۔ اس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آ رہے تھے اور سارطیاں، چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے..... میں نے سنا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے شاید اسی لئے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا اور خوب شان سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں۔ ایسی شان شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں درسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا

خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا رد عمل شروع ہوا میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اسے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آگئی تھی۔ اس لئے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ جو لوگ سچ مچ امیر ہوں انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیئے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا کہ.....؟

میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بمشکل دس کا نوٹ بھیج سلامت لے گھر پہنچا۔ شمی میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اس نے آگ پھونکنی شروع کر دی ـــــ کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے اور بھی زیادہ دھواں اٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ ان سے پانی بہنے لگا۔

"کم بخت کہیں کا..... منگل سنگھ" میں نے کہا "ان پرنم آنکھوں کے لئے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں....."

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ چٹخنے لگیں۔ آخر ان پرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصے کی آگ بجھا دی..... شمی نے میرے شانہ پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی:

"اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔"

میں نے دھیمی سی آواز سے کہا "ہاں!"

"میں دوں؟..... یہاں سے....."

"میں دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہتے ہیں۔"

کوٹ کو الٹتے ہوئے شمی بولی: "اسٹر کو تو موٹی مڈیاں چاٹ رہی ہیں..... فقط ریشم کا ہے نا..... یہ دیکھئے!"

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا اور کہا "شمین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی..... دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آ رہا ہوں..... یہ کام تم اس وقت کر لینا جب میں سو جاؤں۔"

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی "میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں..... اسے مرمت کرنے میں اس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے۔ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں..... آخر آپ اپنے کوٹ کے لئے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟"

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا اگاؤ خیال کرتا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں..... ان آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے میں مثل مسلم تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خرید لوں۔ نئے گرم کوٹ کے لئے کپڑا

خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ پشپا منی بھاگتی ہوئی کہیں سے آگئی۔ آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اس کی حرکات کتا کلی مدا سے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

مجھے دیکھتے ہوئے پشپا منی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کر دیا۔ بولی:

"بالو جی..... آپ آگئے؟ ــــ آج بڑی بہن جی (استانی) نے کہا تھا میرے لئے دو سوتی لانا اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گیتا ماپ کے لئے اور گرم کپڑا....."

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگائی اور بولی:

"اس جہنم جلی کو ہر وقت..... ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے..... مشکل سے انہیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں....."

ــــ وہ پشپا منی کا رونا اور میرا نیا کوٹ!

میں نے خلاف عادت اونچی آواز سے کہا: "شمی!"

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا: "میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو..... ابھی..... کسی طرح کرو..... لیکن جیسے روپیٹ کر مشکل سے کی گئی لکڑیاں جلا لیتی ہو..... تمہاری آنکھیں! اوں! یاد آیا..... تمہیں پشپا منی کیسے دے رہی ہے۔ پوپی بیٹا! ادھر آؤ ذرا..... ادھر آؤ میری پکی! کیا کہا تھا تم نے؟ بولو تو..... دو سوتی؟ گیتا ماپ کے لئے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا؟ ــــ بچہ ہنسا بھی تو ٹرا مشکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے لئے مچلتا سو گیا ہوگا۔ اسے غبارہ نہ دو گی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا؟..... کتنا روپا ہوگا بے چارہ..... شمی! کہاں ہے پگلی؟"

"جی سو رہا ہے ....." شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

"اگر میرے گرم کوٹ کے لئے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کرو گی تو مجھے تمہاری آنکھوں کی پرواہی کیا ہے؟" پھر میں نے دل میں کہا: کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لئے ہو رہا ہے۔ شمی سچی ہے یا میں سچا ہوں۔ پہلے میں نے کہا ـــــ دونوں.... ...مگر جو سچا ہوتا ہے اس کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے۔ میں نے خود ہی دبتے ہوئے کہا:

"تم خود بھی تو اس دن کافوری رنگ کے بیناکار کانٹوں کے لئے کہہ رہی تھیں....."

"ہاں.... جی.... کہہ تو رہی تھی مگر....."

مگر..... گو اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ایک بڑا خزانہ معلوم ہو رہا تھا!

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کر دیا۔ ایک جگہ جہاں پر سے کپڑا بالکل اڑ گیا تھا۔ صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پر بدنما سلوٹیں پڑ گئیں اس وقت معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اور یہ میرے تخیل کی پختہ کاری تھی۔ میرے تخیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ میں نے دل میں کہا: معراج الدین کی دکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے..... میں ایک معمولی کلرک ہوں... ... اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا عبث ہے.... عبث.....

مجھے فارغ پا کر شمی میرے پاس آ بیٹھی اور ہم دونوں خریدی جانے والی چیزوں کی فہرست بنانے لگے..... جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے بھی آ جاتے ہیں... پشیمانی اور

بچہ آ گئے۔ آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

میں نے شمی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ یوں ہی کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے رسے پہلے لکھے۔ اچانک رسوئی کی طرف میری نظر اٹھی۔ چولہے میں لکڑیاں سرسوسر جل رہی تھیں..... اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دہکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

"وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں اور کھو کھا"... شمی نے کہا۔

"اور اوپلے؟"

"جی ہاں، اوپلے بھی....."

"منگل سنگھ دیوتا ہے..... شاید میں بھی عنقریب گرم کوٹ کے لئے اچھا سا اوورکوٹ خرید لوں تاکہ تمہاری آنکھیں یونہی چمکتی رہیں۔ انہیں تکلیف نہ ہو ـــــ اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں..... اگلے ماہ ضرور..... ضرور....."

"جی ہاں، جب سردی گذر جائے گی....."

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھائیں۔ دو سوئی، گنیا ماپ کے لئے گرم بلینر، سبز رنگ کا ایک گز مربع، ڈی، ایم، سی کے گولے، گولے کی مغزی ـــــ اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن... موتی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھی میں چاہتا تھا کہ لیمانی دواخانہ سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبہ بھی لا رکھوں۔ روحہ کے ساتھ تھوڑا سا کھا کر سو جایا کروں گا مگر موتی پشپا نے اس کے لئے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی اور سب پشپا منی نے کہا "گلاب جامن" تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے..... شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا جہاں سیڑھیوں میں باہر جھڑ اپنا دودھ کا کلسہ

رکھ دیا کرتا ہے اور پشپا سے کہوں گا کہ میں تو لانا ہی بھول گیا تمہارے لئے گلاب جامن!
.....اوہو ہو..... اس وقت اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا اور گلاب جامن نہ پا کر اس
کی جیب کی حیثیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائسکل کے لئے ضد کر رہا تھا میں نے
ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا "اطریفل زبانی؟" شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی
تھی "بچو بیٹی کو ٹرائسکل لے دوں گی۔ اگلے مہینے..... بچو بیٹی سارا دن چلایا کرے گی
ٹرائسکل..... پوپی منا کچھ نہیں لے گا....."

بچو چلایا کرے "گی" اور پوپی منا نہیں لے "گا"!

——— اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی کہ جب تک ٹرائسکل کے لئے چھ سات
روپے جیب میں نہ ہوں میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گذروں گا۔ اس لئے کہ رقم نہ ہونے
کی صورت میں نیلے گنبد کے بازار سے گذرنا بہت معیوب سا ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ
پر غصہ آئے گا۔ اپنی ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اس وقت شمی بھی آئینے کی بیضوی مکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں
کھڑی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میں بتاؤں تم اس وقت
کیا سوچ رہی ہو؟"

"بتاؤ تو جانوں....."

"تم کہہ رہی ہو۔ کافوری سپید سوٹ کے حامل وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے
پہن کر ضلعدار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو دنگ رہ جائے....."

"نہیں تو" شمی نے ہنستے ہوئے کہا "آپ میری آنکھوں کے مداح ہوتے تو

کبھی گا گرم ....."

میں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بسی میں بدل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا "بس..... ادھر دیکھو..... اگلے مہینے..... ضرور خرید لوں گا....."

"جی ہاں، جب سردی....."

—— پھر میں اپنی اس حسین دنیا کو، جس کی تخلیق پر محض دس روپے صرف ہوئے تھے، تصور میں بسائے بازار چلا گیا۔

میرے سوا انارکلی سے گذرنے والے ہر ذی عزت آدمی نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا لاہور کے ایک لحیم شحیم جنٹلمین کی گردن نکمائی اور مکفت کالر کے سبب میرے چھوٹے بھائی کے پالتو کتے "ٹائیگر" کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"لوگ سچ مچ بہت مفلس ہو گئے ہیں..... اس مہینے معلوم کتنا سونا چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔" کاٹنوں کی دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کاٹنے دیکھے۔ اپنی تخیل کی پختہ کاری سے میں شمی کی کافوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کاٹنے پہنا کر پسند یا ناپسند کر لیتا..... کافوری سپید سوٹ..... کافوری مینا کار کاٹنے..... کثرت اقسام کے باعث میں ایک بھی منتخب نہ کر سکا۔

اس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے جو دو اپریل کلب تھی پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر اگر مسرتی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔

نچلی بائیں جیب پر ایک روپے کے برابر کوٹ سے ملتے ہوئے رنگ کا پیوند بہت ہی نامزوں دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔ میں اسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے پہلے میری جیب کی سلوٹیں اور وہ روپے کے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ لیا ہو۔۔۔۔ اس کا بھی ردِ عمل شروع ہوا اور میں نے ولیری سے کہا:

"مجھے کیا پروا ہے۔۔۔۔ یزدانی مجھے کون سی تعلیل بخش دے گا۔۔۔ اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سنتا سنگھ نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ وہ رفعتِ ذہنی کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور ورسٹڈ کی کم۔"

مجھ سے کوئی پوچھے۔ میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور رفعتِ ذہنی کی کم!

یزدانی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں غور سے اس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپا منی کے گلاب جامن اور امرتیاں خریدنی چاہئیں۔ کہیں واپسی پر یہ چیزیں بھول ہی نہ جاؤں۔ گھر پہنچ کر انہیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا۔ مٹھائی کی دکان پر کھولتے ہوئے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپا منی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے خیال کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا۔

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لئے جیب ٹٹولی تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سوراخ ہو رہا تھا۔ نقلی ریشم کو ٹڈیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ جہاں مرا انجا، مرا انجا اینڈ کمپنی کا لیبل لگا ہوا تھا میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔

ایک لمحہ میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے کوئی بھولی سی بھیڑ اپنی خوبصورت پشم اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا۔ خود ہی بولا:

"کوئی بات نہیں بابو جی۔۔۔۔۔ پیسے کل آجائیں گے۔"

میں کچھ نہ بولا۔۔۔۔۔ کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہارِ تشکر کے لئے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ دو غن میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دو تین میں سے آتشیں سرخ امرتیاں جگر پر داغ لگا رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور ذہن میں پشپا منی کی دھندلی سی تصویر بکھر گئی۔

میں وہاں سے باوا می باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹے کے قریب باوا می باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصہ میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ کرتا ہوا انجن جس میں سے دہکتے ہوئے رخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے ـــــ مگر اس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اوور ٹائم لگا کر واپس لوٹ رہے تھے۔۔۔۔ میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

"قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے۔" میں نے کہا "پشپا منی کے لئے گوٹے کی منزی

دوستی، گلاب جامن اور شمی کے لئے کافوری مینا کار کانٹے نہ خریدنے سے بڑھکر کوئی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ کس بیرحمی اور بیدردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دینار برباد کر دی گئی ہے ..... جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک شاہکار توڑ پھوڑ کے رکھ دوں۔

—— مگر پانی میں کشتی ران لڑکا کہہ رہا تھا:

"اس موسم میں نوراوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا۔"

"سارا پانی تو اوپر سے اپر باری دواب لے لیتی ہے ..... اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی!" ..... دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پشپا منی اور بچو ننھا بہت دیر ہوئی دھیر سے اٹھ کر بستروں میں جا سوئے تھے۔ شمی چولھے کے پاس شہتوت کے نیم جان کیڑوں کتا پتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی ..... کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سرے ہوئے ہوں اور کھونٹی پر لٹکتے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کئے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں پول کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دو دو گھونٹ

پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کر دیا اس لئے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ وہ دفعت ذہنی کی درسٹڈ سے زیادہ پرواہ کرتے تھے۔

اگر میں گھر میں اس دن شمی کو دہی کا فری سفید سوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر نہ آتا تو شاید پریل میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا۔ کاش! میری جیب میں بھی ایک دو روپے ہوتے۔ کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا ——— مگر میری جیب میں تو کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ درسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سیکرٹری سے جھگڑ رہے تھے۔ نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو پریل کلب اور بار بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور کہا "میری بچوں کے لئے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے پریل کھیلنے کے لئے تو اسے اپنی گرہ سے دام دے دینے چاہئیں۔ ہی ہی ..... ہی ہی ....."

اندرونی کیسہ ..... بائیں نچلی جیب ..... کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہوا۔ اسے سرکاتے ہوئے ..... میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

——— وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو اس دن اندرونی جیب کی تہ کے سوراخ میں سے گذر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا۔

اس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اس کی خواہش کے مطابق پریل وریل نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اس دن میرا انتظار کئے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین دنیا کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی۔ جب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا اور بولی:

"اتنے قلعے مت بنائیے..... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی۔"

"شمی ٹھیک کہتی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے۔"

پھر میں نے کہا۔ "ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے..... تمہاری کھیپ پر دس بازار جا رہی ہے اس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ..... کافوری مینا کار کنگنے..... ڈی ایم سی کے گولے، مغزی..... اور دیکھو پوپی منا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا..... ضرور....."

شمی نے کھیپ کے ساتھ جانا منظور کر لیا اور اس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر اس دن میں دیر تک بچے تھے کہ اس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی سے ایندھن کی کولکی، غسلخانے نیم چھت پر ــــ سب جگہ اسے ڈھونڈتا پھرا۔ میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا:

"وہ ٹرانسکل لینے گئی ہے..... نہیں جانے دو۔ ٹرانسکل گندی چیز ہوتی ہے اخ تھو

..... غبارہ لائے گی بی بی تمہارے لئے بہت خوبصورت غبارہ ..... "

بچہ بیٹی نے میرے سامنے تھوک دیا، بولی "اسے ..... ای ..... گندی"

میں نے کہا "کوئی دیکھے تو ..... کیسا بیٹیوں جیسا بچا ہے"

پشپا سنی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا "پوپی منا ..... آج گلاب جامن جی بھر کر کھائے گا ..... "

اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گود سے اتر پڑی اور بولی "ایسا معلوم ہوتا ہے ..... جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں"

بچہ روتا رہا۔ پشپا جامنی کتھا کی مدد سے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچتی رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔ کہ میں میرے تخیل کے قلعے زمین پر آ رہیں۔ اسی وقت میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا شمی اب گھونے ہسپتال کے قریب پہنچ چکی ہو گی ..... اب کالج روڈ کی نکڑ پر ہو گی ..... اب گلے سوانجن کے پاس .....

اور ایک نہایت دھیمے انداز سے زنجیر ہلی۔

شمی سچ مچ آ گئی تھی۔ دروازے پر۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی "میں سوچ رہی تھی کہ بھیجے سے آدھا سے کر بھی نہ پہنچ کر لوٹ آئیں"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

پھر پوپی منا اور میں تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے میز پر بنڈل کھولا ..... .

——— وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس ٹویڈ تھا۔
پشپا مئی نے کہا "بی بی! میرے گلاب جامن . . . . "
شمی نے غصے سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی!

چھوکری کی لوٹ

بچپن کی بہت سی باتوں کے علاوہ پرسادی رام کو چھوکری کی لوٹ کی رسم بھی یاد تھی۔

دو بیاہے ہوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا کسی قدر مشکل ہوتا ہے خصوصاً جبکہ ان میں سے ایک تو صبح و شام کمی شکر میں ملا کر کھانا پسند کرے اور دوسرا اپنی ذہین صورت بیوی کے راستے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے کانوں کا کچا ہو۔ لیکن خوشحالی کی ڈیوڑھی پرسادی کے پتا چمبا رام اور تایا ٹھنڈی رام جگت گورو اپنے باپ دادا کے مکان میں اکٹھے رہتے آئے تھے۔ یہ اکٹھے رہنے کی وجہ ہی تو تھی کہ چمبا رام کا کاروبار اچھا چلتا تھا اور ٹھنڈی رام کو نوکری سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ عورتوں کی گودیاں ہری تھیں اور صحن کو برکت تھی اور وہاں آم کے ایک بڑے درخت کے ساتھ کھرنی کا ایک خوبصورت سا پیڑ اگ رہا تھا جس کے پتوں سے کچھڑی ہوتی ہوئی گلکوندہ کی ریل پانڈ میں چھلا مل کی دوکان تک پہنچ گئی تھی اور آس پاس کے

گاؤں سے آنے ہوئے لوگوں کو ٹھنڈی میٹھی چھاؤں دیتی تھی۔

پرماتما کی کرپا پرسادی کی پیدائش کے ڈیڑھ دو سال بعد پھر رام کلی بس ہو گئے مگر جگت گرو کی نے بھاوج کو بیٹی کر کے جانا اور پرسادی کو اپنا بیٹا کر کے پہچانا۔ اور تائی اماں بھی تو یوں بڑی دھیرج اور سادگی کے دو موقعوں کے سوا جب کہ بٹوارہ گھر میں آتا اور پرسادی کی ماں کے ساتھ غصہ پیشانی سے پیش آتیں کبھی تو یہ گمان ہونے لگتا جیسے دونوں ان جانی بہنیں ہیں۔ اس اتفاق کی وجہ سے صحن کی برکت ہاں کی تول رہی۔ صحن میں چار پانچ برس سے لے کر بیس اکیس برس تک لڑکیاں بھیلے بدھائی کھیلتے اور دیس دیس کے گیت گاتیں پھر نئے گاتیں اور عورت کی بڑی بڑی ہتھیلیاں مینڈھیوں کی طرح گوندھ کر بھائی کے لئے جولاہے کے ہاں بھیجتیں۔ کبھی کبھی کسی کے سر میں ان کا رت جگا ہوتا تو صحن میں خوب رونق ہو جاتی اس وقت تو پرسادی سے چھوٹے کو پڑوسیوں میں سے گلگلے، میوے، بادام، برفی وغیرہ کھانے کے لئے مل جاتی۔

پرسادی کی بہن رتنی ——— اس کی تائی کی بیٹی عمر میں پرسادی سے گیارہ بارہ برس بڑی تھی۔ رتنی سے عمر کے اس فرق کا پرسادی کو بہت گلہ تھا۔ اور گلہ تھا بھی بالکل بجا۔ سچ پوچھو تو رتنی ایک پل بھی اس کے ساتھ نہ کھیلتی تھی۔ البتہ سردیوں میں سوتی ضرور تھی، اور جب تک وہ پرسادی کے ساتھ سو کر اس کے بستر کو گرم نہ کر دیتی پرسادی مچلتا رہتا۔

"رتنی آؤ..... آؤ نا رتنی..... دیکھو تو مارے سردی کے سُن ہوا جاتا ہوں۔"

رتنی بہت تنگ ہوتی تو پٹ کر کہتی "سو جا، سو جا منڈی کاٹے... میں کوئی انگیٹھی تھوڑے ہی ہوں۔"

یہ تو ہوئی ناراضگی کی بات۔ دن کو رتنی کسی اپنی ہی دھن میں مگن رہتی۔ ہوئے ہوئے گاتی

..... بیٹھے لاگے والے بول ..... .

آخر کوئی تو پرساوی کے ساتھ کھیلنے والا چاہیئے تھا۔ جب وہ بالکل اکیلا ہوتا تو اسے کچھ کچھ سمجھ آتی کہ کال بس ہو کر سورگ میں چلے جانے کا کیا مطلب ہے۔ وہاں لوگ اکیلے رہتے ہیں لیکن انہیں کوئی بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ جب وہ سوچ سوچ کر تھک جاتا تو دوڑا دوڑا تارا رانی کے جوہڑ پر پہنچ جاتا۔ تمام کپڑے اتار کر کنارے پر رکھ دیتا اور کچھ دیر پانی میں جا کر ایک آدھ ڈبکی لگاتا۔ اور بہت چکنی مٹی نکالتا اور گھر جا کر رتنی کو دیتا۔ تاکہ وہ اسے ایک منا بنا دے۔ بہت خوبصورت مٹی کا منا اور پھر وہ تمام دن منے کے ساتھ کھیلتا رہے گا اور اسے تنگ کرنا چھوڑ دے گا۔ رتنی کہتی "دیکھو پرسو ..... میں تب بناؤں گی تمہارے لیے منا اگر تم کوٹھا پھاند کر ٹلو کنھیا کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ آج شام وہ رتنی بہن کو ضرور ملیں"۔

ٹلو کنھیا کے مکان کی ڈھلوان سی چھت کو رینگ کر چڑھنا کوئی کھیل تھوڑا ہی تھا۔ رتنی خود گھوڑی بن کر پیٹھ کی اوٹ دیتی۔ تب کہیں پرساوی منڈیر تک پہنچتا۔ لاکھ آسرا لینے پر بھی اس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل جاتے اور اتنی محنت کے بعد جب پرساوی لوٹتا تو دیکھتا کہ رتنی کی بچی نے کوئی منا وا نہیں بنایا اور پھلکاری کی اوڑھنی کو بوڑھی جھلارنی کی طرح منہ پر کھسکائے وہی بالکل فضول اور بے مطلب سا گانا گنگنا رہی ہے ..... بیٹھے لاگے والے بول ..... .

اس وقت پرساوی کی بہت بری حالت ہوتی۔ وہ چاہتا کہ وہ بھی کال بس ہو جائے۔ مگر کال بس ہونے سے پہلے بہت ہی بھیانک کر بخار آتا ہے۔ ہڈیاں کڑکتی ہیں۔ بوٹی بوٹی دکھتی دیتا ہے گویا کوئی بڑا سا خوفناک کالے رنگ کا بھینسا سینگ مارنے کو دوڑا آ رہا ہے

انسان ڈر ڈر کر چھینیں مارتا اور کانپتا ہے۔ پرسادی کو یہ باتیں تمہید آ منظور نہ تھیں۔ بیٹھے بٹھائے پل بھر میں کال بس ہو جانا کسی بھاگوان کو ہی ملتا ہے۔ اس وقت وہ روتے ہوئے ماں کے پاس جاتا اور کہتا:

"چندو کے گھر مرتا ہے..... بیرو کے گھر مرتا ہوا ہے ماں..... ہمارے گھر کیوں نہیں ہوتا مرتا؟..... تم ایسا جتن کرو ماں، ہمارے ہاں بھی ایک مرتا تو ہو جائے۔"

پرسادی کی ماں ایک بہت گہرا اور ٹھنڈا سانس لیتی اور چھینکتی ہوئی لوہے کے ایک بڑے ہاون دستے میں لال لال مرچیں کوٹتی جاتی اور نہ جانے اس کے جی میں کیا آتا کہ پرسادی کی طرح بلک بلک کر رونے لگتی۔ پھر ایکا ایکی سب رونا دھونا چھوڑ کر تیزی سے موڑتے پرسادی کو چھیلنے کے لئے رگڑنا شروع کر دیتی اور جب پرسادی بالکل خدہی کئے جاتا تو وہ کہتی:

"پرسو بیٹا! یوں نہیں، کہا کرتے اچھے لڑکے..... تمہارے پتا لایا کرتے تھے مرتا..... وہ اب رو ٹھ گئے ہیں۔"

"تو پتا کو کہئے نا..... وہی لا دیں ہمارے گھر مرتا....."

"وہ مرتا اپنے ہی گھر لائیں گے..... پگلے کوئی کسی کے گھر مرتا نہیں لاتا..... بھاگ جاؤ۔ کھیلو، بہت باتیں کرو گے تو مار دوں گی۔ ہاں!"

——— پرسادی کو کیا۔ وہ تو سچا بنا تھا کہ اسے کسی طرح ایک مرتا مل جائے۔ افسوس اس بچارے کو تو کوئی مٹی کا مرتا بھی بنا کر نہ دیتا تھا۔

کسی برساتی شام کے صاف اور سنہری جھٹ پٹے میں وہ برکت والا صحن ہر نوع و ہر عمر کی

لڑکیوں، رنگ رنگیلے پرخلوں اور پھولوں کی ٹوکریوں سے بھرنا شروع ہو جاتا۔ تمام لڑکیاں عمر کے لحاظ سے دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر گکرونڈہ اور کھڑکی کی آڑ میں بیٹھ جاتیں۔ چھوٹی لڑکیوں کی ٹولی علیحدہ کھڑکی کے نیچے ہوتی۔ اس لئے کہ بڑی لڑکیوں کا خیال تھا کہ ان کل کی بچیوں کو چھڑی اوڑھنے کا تو سلیقہ نہیں، اور وہ ان کے گانے کو بھی تو نہیں سمجھ سکتیں، صرف منا کر ایک ٹک ان کی طرف دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ پھر شرم آنے لگتی ہے۔ سر نڈال ہو جاتا ہے۔ گانا گلے میں اٹک جاتا ہے۔ اور پھر ملو کنیا کے متعلق باتیں کرنے میں انہیں کوئی مزا نہیں آسکتا۔ ..... اور وہ تکلے پر سے دھاگے کی لمبی سی تار اٹھاتی ہوئی یکدم رک کر انتی کے پیچھے ٹوکری میں سے بھنے ہوئے دانے اور گڑ کے انہیں تھما دیتی۔ سب کی سب گم تھیں۔ رتنی کی طرح ..... اور ان کے چھوٹے بھائی ان کے ساتھ سخت سردی میں سونے کے لئے مچلتے تھے۔

رام کلی دو سخنہ کہتی اور دوسری کوئی راگ الاپ کر اپنا سر گکرونڈہ میں چھپا لیتی۔ تیسری انمل کہتی ہوئی بیلی سے لپٹ جاتی اور سب آم پر کوئل کو کوکتی تو دھیرا کہتی ہائے ہائے ..... جانے بڑا ہی دکھ پہنچ رہا ہے۔

اسی لئے تو وہ چھوٹی لڑکیوں سے کہتی کہ الگ بیٹھتی تھیں۔ پرسادی نے چھوٹی لڑکیوں کو اس قسم کا دکھ پہنچتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو سب چاپ کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر پہیلیاں کہتیں۔ انہیں اور خود پرسادی کو وہی سیدھی سادی پہیلیاں بہت پیاری تھیں۔ اس لئے کہ ان کی اپنی زندگی بھی ایک سادہ سی پہیلی تھی۔ ان پر وہ راز نہیں کھلا تھا جو رام کلی، رتنی، کیسو، دھیرا اور ستا بائی بڑی لڑکیوں پر آشکارا ہو گیا تھا۔

ہاں! ایک بات پرسادی نے بہت محسوس کی۔ وہ یہ تھی کہ گکرونڈہ کی نوٹنکی بیٹھنے والی

بڑی لڑکیوں میں آئے دن تبدیلی ہوتی رہتی۔ اور جیسے بھری دنیا میں دائیں یا بائیں سے کبھی کبھی آواز آتی ہے کہ فلاں کال بس ہوگیا۔ اسی طرح ان میں سے آواز آتی:

"چھپر بھی بیاہی گئی....."

یا ــــ

"رام کلی بیاہی گئی..... چلو چھٹی ہوئی..... پرماتما کرے اپنے گھر بیٹھی لاکھوں برس سہاگ منائے..... لاکھوں برس۔"

اور پھر ــــ

"بہن! دھیرا کے بغیر تو گانے کا مزا ہی نہیں آتا۔ کیسی لٹک کے ساتھ کہتی تھی "دابن سب جگ لاگے پھیکا" کتنی سندر تھی۔ جب ناک میں تیلی ڈالتی تو یوں ہی دکھائی دیتی جیسے گھنوں سے لدی ہو۔"

اور پھر ایک اور بول اٹھتی ــــ "دھیرا بہت گڑ کھاتی تھی..... کہتے ہیں بہت گڑ کھانا اوناء کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔"

ــــ تو کیا گکرونڈہ کے نیچے بیٹھی ہوئی ٹولی میں کمی واقع ہو جاتی؟ بالکل نہیں کیونکہ چھپر رام کلی اور دھیرا کی مانند سہاگ منانے کے لئے چلی جانے والی لڑکیوں کی جگہ کھرنی کے نیچے پہیلیاں کہتی سنتی ہوئی لڑکیاں آہستہ آہستہ پڑ کر دبتیں اور کھرنی کے نیچے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے محلہ شمسوانی ٹولہ کی بالیں کثرت سے چھوکریاں جنتیں اور یوں سلسلہ بندھا رہتا۔ یا شاید یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ جگت گورو جی کے صحن میں وہ دیل پیل وہ دھما چوکڑی ہمیشہ بنی رہے۔

گھمرا پوہ کے دن تھے جب لکھ سنکرانت آئی اور عورتیں ڈھکے ہوئے پھل پھولوں کا تبارلہ

کرنے لگیں اور ایک دوسری کے سہاگ کو عرصہ تک قائم رہنے کی دعائیں دینے لگیں۔ کنواری کرکلاؤں سے بھی آنے والی خوشی کی زندگی کی پیش قدمی میں ایک دوسری کے شگن مناتے لگے کے مردان عورتوں کی آزادی میں مخل ہونے سے ڈرتے ہوئے اپنی اپنی گڑگڑی وغیرہ اٹھا کر ٹھاکر دوارے چلے گئے..... پرساوی کی تائی اماں ان دنوں بہت فکر مند رہتی تھیں۔ کہتی تھیں: "میں چھوکری کے ہاتھ پیلے کروں تو اپنی نیند سوؤں۔ ابھی تک بر نہیں ملا..... یہ سنجوگ کی بات ہے نا..... پرماتما ہی کرن ہار ہے..... استری مرد کا وہی میل ملاتا ہے..... جہاں سنجوگ ہوں گے..... ہے بھگوان——!"

اس روز تمام عورتیں برآمدے میں بیٹھی ٹھٹھے اور ہنسی مذاق کی باتیں کر رہی تھیں، ایکا ایکی پرساوی کی تائی اماں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"لو بیٹی..... تیار ہو جاؤ سب..... اب میں اپنی چھوکری کی لوٹ مچاؤں گی....."

——اس تہوار میں یہ رسم بھی عجیب ہوتی ہے۔ جس کی لڑکی بہت جوان اور شادی کے قابل ہو جائے وہ اس کی لوٹ مچاتی ہے۔ تائی اماں کی طرح کوئی بوڑھی سہاگن اٹھ کر گری چھوہارے، بیر اور قسم قسم کی پھل پھلاری لڑکی کے سر پر سے مٹھیاں بھر بھر کر گراتی ہے جب وہ چیزیں نیچے بکھر جاتی ہیں تو تمام کنواری کرکلائیں اور سہاگنیں پھل پھولوں کو لوٹنے کے لئے جگت گورو جی کے صحن میں لگے ہوئے پیڑوں اور بیل کے پتوں کی طرح کھچڑی ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ پھل کھائے۔ اگر سہاگن کھائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے سہاگ کی عمر لمبی ہو جاتی ہے——شاید لاکھ برس تک! بانجھ کھائے تو اس کے چاند سا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ کنواری کھائے تو اس کی عنقریب ہی شادی ہو جاتی ہے۔ اچھا سا بر مل جاتا ہے۔ اسی لئے تو کنواری لڑکیاں اٹھا کر چپکے چپکے اور چوری چوری وہ پھل کھاتی ہیں۔

پرسادی نے دیکھا۔ رتنی آپے سے باہر ہو رہی تھی ..... پرسادی کی ماں نے اسے بتایا کہ چھوکری کی لوٹ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمہاری رتنی بہن کو کوئی بیاہ کر لے جائے گا ـــــ کوئی لوٹ کر لے جائے گا ..... اور پرسادی کی اماں ہنسنے لگیں۔ "تائی اماں خود بھی تو اپنی چھوکری کے لوٹ جانے کو پسند کرتی ہیں اور ایسے آدمی کی متلاشی ہیں جو کہ اسے سر سے پاؤں تک اپنی ہی ملکیت بنا کر ڈولی میں بٹھا چلی دے اور بڑے شور و غوغا کے ساتھ ..... باجے بجاتا ہوا ..... اور پھر گھر ہی آدھی جائداد سمیٹ کر لے جائے ....."

پرسادی نے سوچا۔ کسی کو کیا مصیبت پڑی ہوگی۔ سر پہلوں میں رتنی چلی جائے گی تو اس کے بستر کو کون گرم کرے گا؟ تائی اماں تو برف کی طرح ٹھنڈی ہیں اور اماں تو تمام رات کھانستی رہتی ہیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پہلو بدلتی اور چھت کی کڑیاں گنتی چلی جاتی ہیں۔ نہ آپ سوتی ہیں۔ نہ سونے دیتی ہیں۔ کہتی ہیں میرے ساتھ سونا اچھا نہیں ..... مجھے دق ہے!

•

تایا جگت گورو ٹھنڈی رام بہت کاریگر تھے۔ تبھی تو لوگ انہیں جگت گورو کہتے تھے۔ صبح شہر میں بھیجنے کے لئے کیلنڈروں کی چٹھیاں بنواتے رہے۔ آٹھ بجے کے اندر اندر کھوئے میں گھر پہنچ کر کھانا کھایا اور پھر جھٹ سے کام پر بھی چلے گئے۔ بلا کے آدمی تھے جگت گورو۔ اس دن پرسادی بھی ان کے ساتھ کام پر گیا۔

جگت گورو چنگی محصول پر مقرر تھے۔ تمام دن وہ گلشن میں استعمال ہونے والے گلاب کے پھولوں اور خام کھالوں پر محصول لگاتے رہے۔ کبھی کبھی کسی سے کچھ لے کر اسے یونہی چھوڑ دیتے۔ آخر جگت گورو تھے اور رتنی کی لوٹ مچانی تھی۔ اس طرح دھیلا دھیلا پیسہ پیسہ کو کیسے ہی تو

کچھ بنتا ہے تبھی تو وہ موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کہتے ہیں رشوت لینے میں انسان موٹا ہوتا ہے اور روح اور ضمیر سوکھ جاتے ہیں لیکن جسم تو دکھائی دیتا ہے۔ روح اور ضمیر کس کو نظر آتی ہے؟

جنگی پرخوشیا اور روفاتی آئے۔ بڑا تہیں اچھا مل گیا تھا۔ بہت ہی اچھا۔ سب سا ہے کی تاریخ لینی تھی۔ جگت گورو نے لڑکے اور لڑکی کی جنم پتری پنڈت جی کو دکھا کر تاریخ سدھوا لی تھی اور جنم پتریاں جیب میں لیے پھرتے تھے۔ خوشیا اور روفاتی کے پوچھنے پر فوراً تاریخ بتا دی۔ لڑکے کی طرف سے کوئی میر مدھایا تھا۔ سب بڑے بھاگ جمان کے..... بڑے بھاگ جمان کے..... کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تائی اماں بڑی بے صبری سے ساہے کا انتظار کرنے لگیں۔ انہوں نے کئی چاندی کے برتن بنوائے۔ سونے کے جھومر، جڑاؤ نکلیں، گھڑی چوڑی اور قسم قسم کے زیور تیار کروا لیے۔ آخر اسی بات کے لیے تو تایا نے کلکتہ میں استعمال ہونے والی کلاب کی گٹھیں دو دو چار چار آنے سے لے کر چھوڑ دی تھیں اور خام کھالوں کی گٹھیں دو دو پانچ چار روپے سے لے کر..... بیسیوں گانٹھیں بڑی کڑاہی، حمام..... ایک بڑا سا پلنگ بھی خریدا تھا تایا نے۔ اس پر پرساوی اور رتنی ایسے چھو سو جائیں۔ پھر کرسی میز، سنگار دان، باجہ، لڑکی کے سوٹ، لڑکے کے کپڑے اور بدائی پر دو پیسے دینے کے لیے شہر کے نوٹ گھر میں سے نئے روپے منگوائے ——— اور پرساوی سوچنے لگا۔ کیا یہ سب کچھ لٹا دینے کے لیے ہے؟

پرساوی نے کہا: "تایا کچھ اتنے سیانے نہیں دکھائی دیتے۔ مگر روفاتی، خوشیا، بیلی رام اور اڑوس پڑوس کے سب آدمی جگت گورو کی واہ واہ کر رہے تھے۔ لڑکی کا دان کرنا سو گائے کے دان کے برابر ہوتا ہے۔ تلا دان سے کم پھل نہیں ملتا۔ وہ سب کہتے تھے بھئی جگت گورو

کو یہ نام جدی تھوڑے ہی ملا ہے۔ اسی لئے تو یہ نام دیا ہے۔ بڑے سیلنے بڑے کاریگر آدمی ہیں۔ ایشور کسی کو بیٹی دے تو لٹانے کے لئے اتنا دھن بھی دے..... واہ وا..... واہ وا.....

پرسادی نے اماں سے تایا کی عقل کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ بیٹا! یہ چھوکری کی لوٹ، آج سے نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے چلی آ رہی ہے۔ سب اپنی اپنی بیٹیوں کو یوں ہی دے دیتے ہیں۔ اتنی دولت اور دھن بھی... ہائے! اس پر بھی بس ہو تو کوئی لاکھ منائے بیٹیوں والے منتیں کرتے ہیں۔ پاؤں پڑتے ہیں۔ کیا جانے اس کے سسرال رُوٹھ جائیں۔ تب جا کر ساری عمر کے لئے کوئی کسی کی بیٹی لیتا ہے۔ کوئی بہت سے ڈھب ہو تو لے دے کر بھی نہیں بساتا..... اور پھر کسی نصیبوں جلی کا بنا بنایا سُہاگ اُجڑ جاتا ہے.....

اور پرسادی کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ بولیں:

"پرسو! تو بھی بڑا ہو گا تو ایک چھوکری لوٹ کر لائے گا۔ اسی طرح دھن دولت سمیت..... ایشور تیری عمر چار جگ لمبی کرے!..... اسے اچھی طرح بسانا۔ مجھے نصیب ہے بس وہ بھاگوان سمے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں گی۔"

اور پرسادی کی ماں رونے لگیں۔ پرسادی نے پوچھا: "تو کہاں چلی جائے گی ماں؟"

وہ اپنی آواز کو دباتے ہوئے بولیں:

"تمہارے پتا کے پاس..... وہ بھی تجھے اسی طرح لوٹ کر لائے تھے، میں نئی کی ہوں۔"

—— پرسادی بجھے ہوئے تنور میں ٹانگیں لٹکائے تمام دن اُداس بیٹھا سوچتا رہا۔ میں بڑا ہوں گا اور ایک چھوکری کو لوٹ لاؤں گا۔ اس لڑکی کے گھر گلرونہ کی بیلی کے نیچے

ایک لڑکی کی کمی ہو جائے گی جسے کوئی اور پُر کرے گی۔ ہاں! وہ بھی تو اپنے کسی بھائی کو سردیوں میں اپنے بستر سے نیچے جم جانے یا تائی اماں کے برف سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر سو جانے کے لئے چھوڑ آئے گی۔ اس کا بھائی تو وہ رہ کب مجھے گالیاں دے گا اور کہے گا اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ میں کالی بس ہو جاؤں۔

سالے کے دن پرسادی کے چچا بہت سے آدمیوں کے ساتھ آئے۔ اگر اماں نہ روکتی تو پرسادی لٹھ لے کر سب کا مقابلہ کرتا۔ پھر کسی کی کیا مجال تھی کہ رتنی کو اتنی بے دردی سے لوٹ لے جانے کی جرأت کرتا۔ اگرچہ جگت گورو اور تائی اماں کی اس لوٹ میں خوشی تھی۔ تائی اماں منڈپ کے نیچے بھٹیاروں اور لکڑیوں کی چھڑیوں کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اردگرد عورتیں گا رہی تھیں۔ باہر باجا بج رہا تھا اور پنڈت جی کے شلوکوں کی آواز اس شور و غوغا سے علیحدہ سنی جا سکتی تھی۔ جب پھیرے ہو گئے تو سب نے تائی اماں اور جگت گورو کو بدھائی دی۔ تائی اماں کی سرخ پھلکاری اور جگت گورو جی کی گلابی پگڑی پر کیسر کے نشان لگائے گئے اور پھر پھول اور پنکھڑیاں برسائی گئیں۔ جانے انہوں نے رتنی کو لٹا کر بہت عقلمندی دکھائی۔ تائی اور اماں نے مسکراہٹ کے ایک احساس سے اس کی لوٹ کی خوشی میں دودھ کے دو بڑے کٹورے بھر کر پیئے۔

پرسادی کو چچا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرسادی نے کہا: یہ مردہ سا، کالا کلوٹا آدمی رتنی بہن کو لوٹ کر لے جائے گا۔ رتنی تو اس کی شکل دیکھ کر غش کھا جائے گی۔ لوٹ کر لے جانے والے ڈاکو ہی تو ہوتے ہیں، بڑی بڑی اور ڈراؤنی شکل کے۔ . . . . . اس میں اور ان میں یہ تو فرق ہے کہ ڈاکو منڈا سا باندھ کر آتے ہیں اور یہ کالا کلوٹا بچہ سہرا باندھ کر آیا ہے۔

جب کہاروں نے ڈولی اٹھائی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ آنچل پھر گھونگھٹ کے نیچے ایک

نشست خالی ہو رہی تھی۔ تائی اماں اونچے اونچے رونے لگیں۔ ہائے! بیٹی کو دھن جیسا ہے پیدا ہوئی راتیں جاگ، مصیبتیں سہہ کر موت سے ٹالا۔ پالا، پڑھایا، جوان کیا۔ اب یوں جا رہی ہے جیسے میں اس کی کچھ ہوتی ہی نہیں۔ ایشور! بیٹی کسی کی کو کھ میں نہ پڑے۔ اس کے دواج ہونے کا دکھ برا۔۔۔۔ ہائے! اس طرح تو کوئی آنکھیں نہیں پھیرتا۔ جگت گورو پرسادی کی طرح بھٹکنے لگے۔ اماں تو در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگیں۔ ہائے! مجھ سے تو رتنی کا بچھوڑا نہ سہا جائے گا۔ میری بیٹی نے تو مجھے دواگ کا دکھ بھلا دیا تھا۔۔۔۔ ہائے! اس سنسار کی ریت جھوٹی، اس سے پریت جھوٹی۔۔۔۔ جا۔۔۔۔ بیٹی جا۔۔۔۔ جا اپنے گھر سکھی رہ۔ تیری مہک ہمیں یہاں آتی رہے۔ تو لاکھوں برس سہاگ مناے۔

تمام لڑکیاں پچھوڑا گاتے ہوئے رک رک گئیں۔

ڈولی کا پردہ اٹھا کر رتنی نے پرسادی کو گلے سے لگا کر خوب بھینچا۔ پرسادی بھی اسے روتا دیکھ کر خوب رویا۔ رتنی کہتی تھی "پر سوچیا ——— میرے لال! تو میرے بغیر سنتا ہی نہیں تھا۔ اب تو رتنی کو کہاں ڈھونڈے گا؟"

پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی:

"مجھے اس گھر میں رکھنے کی کوئی بھی حامی نہیں دیتا۔ سبھی تو میری جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔"

اور جب جیتے جاگتے آدمیوں میں سے کسی نے اسے نہ ٹھہرایا تو رتنی دادا اور چمار رام چچا کو یاد کر کے رونے لگی۔ در و دیوار سے باتیں کرنے لگی۔۔۔۔ میرے بابل کے گھر کے دوارے۔۔۔۔ یہ محل۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ ماڑیاں، میں سمجھتی تھی میرا اپنا گھر ہے۔ کھرنی۔۔۔۔ اور میرے میٹھے آم۔۔۔۔ زوئی پتا! تیرے بستے مندروں میں سے مجھے زبردستی نکال کر لے جا

رہتے ہیں ..... یہاں کا دانہ پانی چھوٹ گیا!"

جب رتنی چلی گئی تو پرساد اسی بچھے بستر پر اداس خاطر بیٹھا اُدھیڑ بُن کرتا رہا۔ طرح طرح کے خیال اور وسوسے اس کے دل میں آتے۔ اس نے کہا۔ تائی اور اماں کے خیال کے مطابق جب پرماتما ہی مرد اور استری کا میل ملاتا ہے تو پھر خوشامد اور دوائی کی کیا ضرورت ہے؟ وہ یوں بھی تو گھر میں سے بیسوں آنا گڑ اور گھی لے جاتے ہیں۔ گٹھوں کے گٹھے گنوں کے ..... ساگ پات، پکا کچا ——— بدماس کہیں کے ..... صرف اتنی سی بات کہتے ہیں "بڑے بھاگ بھوانی کے ..... بڑے بھاگ بھوانی کے" اور لا دیتے ہیں اتنا موٹا سا کالا کلوٹا بھیجا ——— پرماتما کے کھیتوں میں دخل دیتے ہیں نا۔ کیوں نہیں ٹلو کنجیا رتنی کو لے جاتے۔ پرماتما نے آپ ہی تو میل ملایا تھا اور رتنی بھی تو یہی کہتی تھی کہ تمہارا بھیجا ٹلو کنجیا ہے کبھی کسی کے دو دو بھیجے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو ٹلو کنجیا ہی کو بھیجا کہوں گا۔ اس مردوے کو کبھی نہیں۔ لاکھ زور کرے کوئی۔

نہ جانے یہ لوگ چھوکری کی لوٹ کے اتنے خواہشمند کیوں ہوتے ہیں۔ پل پل گن کر سالے لوگ انتظار کرتے ہیں۔ بچیوں کے بعد دودھ کے کٹورے پیتے اور بدھائیاں لیتے ہیں اور پھر جب لوٹ ہوتی ہے تو روتے ہیں۔ اتنا سوچے کون ہوگا جو آپ ہی سب کام کاج کرے اور پھر روئے۔ جانے کوئی کال پڑ گیا ہو اور پھر رتنی کی بھی تو جانے کی مرضی نہ تھی۔ وہ بلبلا پکڑ پکڑ کر روتی تھی۔ بچاری کا بُرا حال تھا۔

سب گھر لٹا دیا اور پھر ہاتھ جھاڑتے رہے۔ قبول کرو میں تو یوں کبھی کسی کے پاؤں نہ پڑوں۔ اوّل تو دوں ہی نہیں۔ دوں تو یوں پاؤں پکڑ منتیں کر کے کبھی نہ دوں۔ نہ لیں تو جائیں بھاڑ میں!

اس دن پرسادی ساری رات تائی اماں کے برف کے سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر جاگتا رہا۔

کچھ دنوں بعد رتنی آپ ہی آپ آ گئی۔ پرسادی کو اس نے بہت چاہا، پیار کیا۔ گویا وہ اب اپنے ننھے سے بھائی کو چھوڑ کر کہیں نہ جائے گی۔ اور اسے خود بھی چھوکری کی لوٹ پسند نہیں۔ اس رات پرسادی بڑے سکھ اور چین سے رتنی کے ساتھ سویا۔ رتنی ساری رات پیار سے پرسادی کو بھینچتی رہی ——— جب صبح سویرے آنکھ کھلی تو رتنی بستر میں نہ تھی۔ پتہ چلا کہ وہی لٹیرا اسے لوٹ کر لے گیا تھا۔

پرسادی پھر رویا مگر ماں نے کہا "بیٹا! یہ رسم آج سے نہیں، جب سے دنیا بنی ہے چلی آئی ہے۔"

سوچتے ہوئے پرسادی نے کہا "بڑے تجربے کرتی تھی رتنی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ چھوکریاں خود بھی لٹ جانا پسند کرتی ہیں۔ وہ تو اپنے سوتے ہوئے بھائیوں کے جاگنے کا انتظار بھی نہیں کرتیں اور کالے کلوٹے چھیا کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔"

اب کے جب رتنی آئی تو چھوکری کی لوٹ کے متعلق پرسادی نے اپنا نظریہ بالکل الٹ دیا تھا۔ اس نے کہا: "دراصل یہ لوٹ سب کے لئے اچھی رہتی ہے۔ تائی اماں، جگت گورو جی اور خود رتنی بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اور خاص طور پر اسے بھی اچھی لگتی ہے۔ جرتا تو مل جاتا ہے۔ رتنی نے اسے چھیا کی طرح نہ ملا پڑا۔ مگر اپنی طرح کا گورا چٹا سا کھیلنے کو لا دیا تو۔"

پرسادی نے ناک کو کیلا لٹکتے ہوئے کہا:

بھولی ماں . . . . تو تو بس کہنے سے رہی . . . . کیا تو نہ لٹے گی ماں؟"

پان شاپ

بیگم بازار کی منحوس دکان میں ایک دفعہ پھر پیلی دار دسوتی کے بھاری بھاری پردے لٹکنے لگے۔ موجد "دافع چنبل و داد" اور جاپانی کھلونوں کی دکان —— اوساکا فیئر (جاپان سے متعلق) کے ملازم استعجاب سے تھارو لال فوٹوگرافر کو اوک پلائی کا ڈارک روم بناتے دیکھ کر اس کے تاریک مستقبل پر آنسو بہانے لگے۔

"ایک ماہ سے زیادہ چوٹ نہ سہے گا . . . . بیچارہ!"

"دکان کیا ہوگی . . . . بازار سے کچھ ہٹ کو ہے نا۔ نظر اُسے سامنے نہیں پاتی اور بس۔"

ایک ماہ، دو اور چار . . . . تھارو لال وہیں تھا۔ موجد "دافع چنبل و داد" اور اوساکا فیئر کے ملازموں نے حیرت سے انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ جب کہ ۱۱۔ اگست کی صبح کو انہوں نے ایک جہازی سائز کا سائن بورڈ اس منحوس دکان پر آویزاں ہوتے ہوئے دیکھا ۶ × ۱۲ فٹ

سائن کے سائن بورڈ پر دیو صورت حروف خالص صنعتی انداز سے ناچتے ہوئے انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کی شکل اختیار کر رہے تھے۔

ادسا کا فیئر کے منتظم صمیم (خان زادہ) نے سیلولائیڈ کی ایک بڑی سی گڑیا کے اندرونی فیتے کو اس کے اندرونی قلابوں سے احتیاط کے ساتھ باندھ دیا (تاکہ گاہک کو شکایت کا موقعہ نہ ملے) اور پھر عطار کی دکان پر آویزاں سائن بورڈ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"انٹر . . . نیشنل فوٹو سٹوڈیو!"

عطار کا کام بیگم بازار۔ اس کے نواح کے تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک یا چھاؤنی کے ہائی سکول تک محدود ہوگا۔ مگر وہ اپنی دکان کو ایک بین الاقوامی کاروبار سے کم نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا عجب جو اسے کسی دن پیٹرو گراڈ، ٹمبکٹو، یا بولو بولو سے فوٹو کا مال مہیا کرنے کے آرڈر ملنے لگیں . . . بہرحال بین الاقوامی نام رکھنے میں حرج بھی تو کوئی نہیں۔ اس نام سے دکاندار کی فطری رجائیت ٹپکتی ہے۔

مگر افسوس! سودے کی بدعت ترقی پسند ہندوستانی دکاندار کو بیگم بازار کے نواحی تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک اور چھاؤنی کے ہائی سکول سے دور کیا جانے دے گی وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے گاہک کو پھنسانے کی کوشش میں کسب کمال کی تو دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ گویا اپنے پاؤں میں آپ بیڑیاں ڈالتا ہے اور یوں زیادہ آمدنی کی توقع میں طبعی آمدنی بھی معدوم! ——— عطار کی دکان پر اس جہازی قد کے سائن بورڈ کے نیچے ایک اور ٹین کی پلیٹ پر جدید عینک ساز بھی لکھا تھا۔ ترقی پسند مگر بھولے عطار نے جدید عینک سازی محض سودے کی بدعت یا نقل میں شروع کی تھی۔ کیونکہ اس کا پڑوسی دکاندار جرابوں کے کارخانے کے ساتھ "ٹیٹا گھر" کا غذ بھی فروخت کرتا تھا۔

۱۱- اگست کی شام کو اوساکا فیئر کا منتظم صبیح (خان زادہ) اور تھارو کچھ اداس خاطر ہو کر ملے۔ دونوں کی آمدنی کا بیشتر حصہ تعطیلات گزارنے یا سرکاری دفاتر کے شملہ کی طرف کوچ کی نذر ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں سٹوڈیو کے سامنے پان شاپ پر بہت رونق رہتی تھی۔

پان شاپ کے پہیے دار تختوں میں کھریا مٹی سے صاف کئے ہوئے شیشے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہلکی سبز جھلک رکھنے والے شیشے کے پیچھے ایک ہک کے ساتھ ایک نفیس طلائی سیکنڈس گھڑی لٹک رہی تھی۔ اس کے نیچے قانون وغیرہ کی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ شاید کوئی قانون کا بے قانون اور فضول خرچ طالب علم اتنی قیمتی کتابیں کوڑیوں کے مول گروی رکھ کر پیسے لے گیا تھا۔ کتابوں کے پیچھے ایک پرانی سنگر مشین پڑی تھی۔ اسے گروی رکھنے والے کو اتنی ضرورت یا اتنی جلدی تھی کہ اس نے مشین پر سے دھاگہ کی گولی بھی نہ اٹھائی تھی۔

پان شاپ کی ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے خاصے پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا گنیش بھی پڑا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک اونچی چوکی پر اپنی کہنیاں رکھے ہوئے اپنے کسی گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔

دو بلاوردی سپاہی پان شاپ کے مالک سے اجازت پا کر برآمدے میں پڑے ہوئے سائیکلوں کے نمبر دیکھ رہے تھے۔

"اے۔ ۱۱۷۸۵ ——— نہیں۔"

"اے۔ ۲۲۳۱۲ ——— یہ بھی نہیں۔"

"ایچ۔ ۹۷۴۰۱ ——— یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں چلو۔"

ایک عیسائی لڑکی دو دفعہ بیگم بازار میں پان شاپ سے نشیبی چوک اور نشیبی چوک سے پان شاپ کی طرف واپس آئی۔ وہ بار بار غور سے پان شاپ کے اندر دیکھتی۔ اس وقت اس کے دبے ہوئے شانے بھرکنے لگتے۔ شاید وہ جانتی تھی کہ پان شاپ کے اندر بیٹھے ہوئے دو ایک آدمی چلے جائیں اور سپاہی اپنا کام کر کے رخصت ہوں۔ تاکہ وہ تخلیہ میں آزادانہ اپنا کاروبار کر سکے یا شاید وہ اپنا مال گروی رکھتے ہوئے جھجکتی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس گروی رکھنے کے لئے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے قدرے عمدگی سے تراشے ہوئے کسمٹی لب پھڑکتے دکھائی دیتے تھے اور اس کی بے خواب اور بھاری آنکھیں بے قراری سے پپوٹوں میں حرکت کر رہی تھیں۔ پسینے سے سفید ململ کا فراق اس کی پشت پر چپٹ گیا تھا۔ اور پشت کی جانب سے اس کی انگیا کے تناؤ کے ریشمی فیتے شانوں پر گول چکر کاٹتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"آج بہت گرمی ہے ـــــ توبہ! ـــــ شام کو ضرور بارش ہو گی ـــــ" اوسا کا فقیر کے منتظم نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

تھارو نے یہ بات نہ سنی اور بہت انہماک سے پان شاپ کے اندر دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کانپتے ہوئے اٹھا اور بولا۔

"اس سے تو میں بھوکا مر جانا پسند کرتا ہوں۔"

صمیم نے غور سے پان شاپ کے اندر دیکھا اور بولا۔

"ضرورت مجبور کرتی ہے میرے بھائی۔ وگرنہ کوئی خوشی سے تھوڑا ہی ۔ ۔ ۔ ۔"

لڑکی پان شاپ سے باہر آئی۔ اس کے بشرہ سے صاف عیاں تھا کہ گروی مال پر اس کے اندازے اور ضرورت سے اسے بہت ہی کم روپیہ ملا تھا۔ نہیں تو اطمینان اور خوشی

کی تحریر اس کے چہرے پر ضرور دکھائی دیتی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے بیمار خاوند پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ اب اس کے پاس سنہری بالوں کے سوا گروی رکھنے کے لئے رہا بھی کیا تھا۔ کاش ان حلقہ دار لمبی لمبی سنہری زلفوں کی ہندوستان میں کچھ قیمت ہوتی۔

لڑکی نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک انگلی کو جڑ سے مسلنا شروع کیا۔ انگلی پر ایک زرد سا حلقہ نظر آ رہا تھا۔ نامعلوم کتنی ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے اپنی عزیز ترین چیز، اپنی رومانوی حیات معاشقہ کی آخری نشانی پان شاپ میں گروی رکھ دی تھی۔ اس نے اپنے رونڈے ہاتھ سے اپنی سنہری زلفوں کو نفرت سے پیچھے ہٹا دیا۔ کیونکہ ان کی کوئی قیمت نہ تھی اور پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھڑا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اس نے اپنے حسین چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھا اور رونے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ وہ حسن فروش نہ تھی۔

•

لوہے کی ایک خوردبین نما نال میں تھار دکر کس کے چند ہلکے سے محدب شیشے ڈال کر نصف گھنٹہ کے قریب ایک بوڑھے کی آنکھوں کا معائنہ کرتا رہا۔ بوڑھے کے سامنے کچھ دور ایک طاق کے ساتھ اُردو کے حروف تہجی آویزاں تھے۔

• تھار دبار بار اس نال کی درز میں کسی نئے اور ہلکے سے محدب شیشے کو رکھ دیتا بوڑھا کہتا۔

"اب، م، تمہارے کوٹھے سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہے۔"

"اب، ظ، سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔"

"اب، ع، دھندلی دھندلی اور پرچھائیں وار نظر آتی ہے۔"

"اب سب حروف دکھائی تو ٹھیک دیتے ہیں ـــــ مگر بہت ہی چھوٹے چھوٹے ... تمہارے کوٹ کے بٹن سے بھی چھوٹے۔"

وہ بوڑھا کیا جانے کہ اگر کسی محدب شیشے میں سے تمام حروف تھنی اپنے قد و قامت کے دکھائی دینے بھی لگیں۔ تو بھی وہ تھارو لال ـــــ "جدید" عینک ساز اور فوٹوگرافر سے نیک دیدہ زیب سیلولائیڈ کا فریم کیا ہوا چشمہ لگوا کر ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائے گا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی "سائنٹیفک" دیکھ بھال کے بعد تھارو نے شیشے کا نمبر ایک کاغذ پر لکھا۔ اور عینک بوڑھے کو دے دی۔

بوڑھا ان امیر گاہکوں میں سے نہیں تھا جو تھوڑے پیسوں کی ادائیگی کے لئے بھی یکم کا وعدہ کیا کرتے ہیں۔ پیسے اس کی مٹھی میں تھے۔ تھارو لال کے مانگنے پر اس نے چند پیسے سے شرابور سکے کونٹر پر بکھیر دیئے۔ ان سکوں کو دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ تھارو نے ایک احریصانہ انداز سے سکے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور اپنا ہاتھ پتلون سے پونچھنے لگا۔

تھارو نے ایک مغرورانہ انداز سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف آدمی جس کا منہ کان تک تمتما رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پان شاپ کے سامنے کی تین سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے اس نے پان شاپ کے پہیے دار تختوں میں کھڑا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں سے اپنے پرشرافت چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھا۔ اور غمزدہ ہو گیا ـــــ کیونکہ وہ بدمعاش نہیں تھا۔

"پان شاپ کا مالک چار دن میں بھی اتنا سود جمع نہیں کر سکتا۔ تھارو نے اپنی جیب میں سکوں کی کھنکار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

پھر تھارد ایک بے سود بے حاصل غرور کے جذبہ کے ساتھ اس پان کے دکانداروں کی آمدنی کا اندازہ لگانے لگا۔

اس لاحاصل جمع خرچ میں بیگم بازار کے بساطیوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ ان کی آمدنی لامحدود تھی۔ اور تھارد کے محدود تخیل سے بہت ہی بالا۔

"ہاں! موجد "رافع چنبل دواد" کے نسخہ کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو آنے ہوگی۔ گندھک، رال، سہاگہ، پھٹکڑی ایک حصہ اور نیلا تھوتھا ۱/۲ حصہ اور ایک مخفی چیز جو اس نسخہ کی کامیابی کی کلید ہے اور جس نے اس عطار کو موجد کا خطاب دیا ہے وہ بھی ایک آدھ پیسہ میں آجاتی ہوگی ــــ اس میں وہ کمانا کیا ہے۔ اور اگا فیئر کے منتظم کو کمیشن بڑی کی بنا پر ملتا ہی کیا ہوگا۔۔۔ ہیئر کٹنگ سیلون والے فی حجامت چار آنے۔۔۔ پانچ آنے کما لیتے ہوں گے۔۔۔" تھارد نے ایک دفعہ پھر جھپکتی ہوئی آنکھوں سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔

اس کی پتلون کی جیب میں پسینہ سے شرابور سکے اس کی رانوں کو گیلے گیلے لگنے لگے۔

اس وقت اوسا کا فیئر کا منتظم آیا۔

ہفتہ بھر اس کی دکان پر سوائے پرچون کے چند گاہکوں کے اور کوئی نہ آیا تھا۔ دسہرہ شب برات، یا دیوالی میں ابھی اڑھائی تین ماہ باقی تھے۔ کیا اوسا کا بڑا آفس اتنی دیر تک انتظار کرے گا؟ صمیم (خان زادہ) کا چہرہ فق ــــ سیاہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے گذشتہ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں اتنے عمر دکھائی دینے کی کوئی خاص وجہ تھی۔

صمیم نے اپنے آپ کو آرام کرسی پر گرا دیا۔ تھارد بولا۔

"یہ پان شاپ کا کام۔۔۔ ہمارے کاموں سے بیک۔۔۔ اقت اچھا بھی ہے۔ اور برا بھی۔"

"اچھا کیسے؟"

"آمدنی ـــــ ہم کوکس کے چشمے اور فریم خریدتے ہیں۔ عکس لینے کے لئے منفی پلیٹیں اور مثبت کاغذ لاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ پان شاپ میں پہلے سے کیا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی میعاد کے بعد لی ہوئی رقم سے لگنی رقم کی چیز چھڑا نے نہ آسکے۔ تو سب کچھ اپنا . . . . اور ایک بڑا سا ڈکار۔"

"برا کیسے؟"

"برا؟ برا ـــــ اس میں دھوکا کا خطرہ ہے۔ یہ لوگ دوسرے کا مال اپنے پاس گروی رکھتے ہوئے اور بغیر محسوس کئے ہوئے اپنا ضمیر اپنے گاہک کے سامنے گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور یہاں سے کبھی کبھی کوئی حسین لڑکی اپنی روحانوی حیات معاشقہ کی عزیز ترین اور آخری نشانی دے کر حسرت کے عالم میں اپنے دو ٹھنڈے ہاتھ کو مسلتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں سنہری زلفوں کی کوئی قیمت ہو۔ تو یہ حریص آدمی ان کو بھی گروی رکھ لیا کریں۔ اگر کسی شریف ادھیڑ عمر کے آدمی کی شرافت لٹکا دو . . . تو یہ لوگ اسے بھی گروی رکھنے سے گریز نہ کریں۔"

اور تھارو مسکرا کر غرور سے سکے اپنی جیب میں اچھالنے لگا۔

دو گھنٹے سے تھارو نے چند منفی پلیٹیں برتنے پانی میں ڈال رکھی تھیں۔ اب وہ ان سے مثبت کاغذ پر عکس اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی گرم ہو چکا تھا۔ منفی پلیٹوں پر مصالحہ پگھل کر لاوہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ تھارو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ کچھ نہ بولا . . . . وہ کچھ بولی ہی نہ سکا۔

یہ اسے چھ روپے کا نقصان تھا۔ ایک عینک کی بچت سے تین گنا زیادہ نقصان۔

تھارو ایک انگڑائی لے کر صمیم کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ایک لمحہ میں اس کی سکت اس کے جسم سے کھینچ لی گئی ہو۔ تھارو ٹکٹکی باندھ کر پان شاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ شیشے کے پیچھے طلائی سیکنڈس قانون و قدر کی کتابوں پر لٹک رہی تھی۔ ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا گنیش بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور ایک دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی صیف پر اپنی کہنیاں سکھے . . . .

اوک پلانی کے ڈارک روم میں دم گھٹ جانے پر تھارو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر مثبت کاغذ پر نقش کو منتقل کرنے والے مرکب کو ہلاتا رہا۔ اس وقت پسینہ اس کی کمر سے ہو کر گھٹنوں کی پشت پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

شاید تھارو اوک پلانی کے ڈارک روم میں پگھل کر اپنی جان دے دیتا اگر صمیم اوسا کا فیڈر کو بند کرتے ہوئے ادھر نہ آ نکلتا۔ تھارو نے صمیم کی آواز پر باہر آتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی قمیص اتاری۔ اس میں سے پسینہ نچوڑا اور قمیص کو پانی کے ایک ٹب میں چھوڑ دیا۔ اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"آج کل ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے؟ . . . .

—— اور بین الاقوامی کاروبار کے شائق تھارو نے ایک پھٹی ہوئی بنیان آہستہ آہستہ سر سے نیچے اتار لی۔

پانی کے ٹب میں تھارو کی قمیص کی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکل کر پانی پر تیرنے

لگا۔ اس پر لکھا تھا۔ تین آنے کا مرکب دو آنے یونین کا چندہ۔ ایک پیسہ کی گنڈیریاں کل سوا پانچ آنے۔

تھارو بولا۔ "یہ میری تمام دن کی آمدنی اور خرچ ہے۔۔۔ تم کنوارا دیکھ کر مذاق کرتے ہو۔۔۔ بیاہ۔۔۔ محبت کتنی میٹھی چیز ہے۔ مگر خالی معدہ میں تو پانی کی سی قیمت بھی جا کر تڑپا دیتی ہے۔"

اوکاسا فیئر کا منظم مبہوت بنا تھارو کے غمزدہ چہرے کے ٹیڑھے میڑھے شکنوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اور بولا۔۔۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔۔۔ ایمانداری کے کام میں بڑا ہی کیا ہے۔۔۔ اوساکا سے چھٹی آئی ہے۔ اگر چھ ماہ کے اندر نقشہ کیفیت میں آمدنی کی مدبھاری یا کم از کم خاطر خواہ دکھائی نہ دی۔ تو پرو کان دہلی کے دفتر سے ملحق کر دی جائے گی۔"

چند لمحات کے لئے دونوں خاموش رہے۔ پھر تھارو بولا۔

"پان شاپ کا مالک دس سے لے کر ۱۲ فیصدی تک خریچر پر دیئے ہوئے روپوں میں سے کاٹ لیتا ہے۔ عام طور پر نیشنل بنک اور پانسے کے سونا پر ایک پیسہ فی روپیہ سود لیتے ہیں۔ مگر ادھر دیکھو صاحب۔ تصویر کی طرف مت دیکھو تمہیں وہ لڑکی یاد ہے نا۔ جس نے مجبوری اور حسرت کے عالم میں اپنی عزیز ترین چیز پان شاپ کے مالک کو دے دی تھی۔۔۔ اس کی انگشتری کی قیمت اسی روپے تھی۔"

خان زادہ اچھل پڑا۔۔۔ تھارو بولا۔

"پان شاپ کے مالک نے خود مجھے بتایا ہے۔۔۔ اس کی قیمت اس نے تیس روپے ڈالی۔۔۔ صرف تیس۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں تیس روپے ایک آنہ فی روپیہ سود لگایا۔

میعاد ۳۱-اگست تک ہے کم بھی نہیں . . . . اس کے بعد وہ انگوٹھی اسی لٹیرے اور درندے کی ہوگی۔"

ایک چیتھڑے سے کسی تصویر کی پشت کو کبوتروں کی بیٹ سے صاف کرتے ہوئے تھارو بولا۔

"میری جیب میں کچی کوڑی نہیں . . . . دکان میں نہ منفی پلیٹیں ہیں نہ مثبت کاغذ۔ . . . بجلی کی طاقت کا ایک بلب فیوز ہو گیا ہے۔ میں کام کیسے کر سکتا ہوں؟"

خان زادہ نے اوسا کا سے آئی ہوئی چٹھی جیب سے نکالی اور شاید دسویں بار اسے پڑھنے لگا کچھ دیر غور و فکر میں غرق رہنے کے بعد تھارو نے تصویر والے چیتھڑے کو میز پر رکھ دیا اور بولا

"بیگم بازار کی منحوس دکان پر اپنی دکھ بھری کہانی کو دہرائے گی . . . عنقریب ہی خالی ہو جائے گی۔ انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کا کام پیٹر وگراڈ، ماسکو یا ہولو لولو تک وسیع ہوتا تو ایک طرف رہا۔ وہ تو بیگم بازار سے نشیبی چوک تک بھی پہنچنے سے قاصر رہا . . . اور کیا بھائی . . . آج کل ایمانداری کے کام میں رکھا ہی کیا ہے . . . ."

مہیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے تھارو کھڑا تھا۔ تھارو جس کا جسم اور روح دونوں ارتقا پذیر ہو چکے تھے۔

پان شاپ کا مالک اور تھارو مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ یکایک پان شاپ کے مالک نے تھارو کو اندر لے جا کر ایک چھوٹا سا کاغذ سامنے رکھ دیا۔

تھارو کا چہرہ کان تک تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے۔ ہکلاتے

ہوئے اس نے کہا۔

"دس فیصدی؟ د . . . د . . . دس فیصدی تو بہت ہے۔"

"تمہیں یہ خاص رعایت ہے . . . . ورنہ بارہ سے کم نہیں۔"

"تم کیمرہ کو فرنیچر میں کیوں گنتے ہو؟"

"اور وہ زیورات میں بھی تو شمار نہیں ہو سکتا۔"

تھارو لال نے پھر ایک دفعہ کاغذ پر نظر ڈالی۔ اور اپنی شعلہ فگن آنکھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"۳۱۔ اگست کو نہیں . . . تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو . . . یکم کی شام تک۔ بابو لوگ یکم کو ہی پیسے دیتے ہیں۔"

بات صرف یہ ہے۔ ۳۱۔ اگست کی رات کو میں شملہ جا رہا ہوں۔ ورنہ یکم ہو جاتی تو کیا پروا تھی . . . عموماً اس معاملہ میں گاہکوں کی رضامندی ہمیں مطلوب ہوتی ہے . . . مگر یہ

مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے ایک شخص باہر نکلا۔ انگلی سے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پان ٹکٹ نکالا۔ بیالیس روپے پان شاپ کے مالک کی میز پر رکھ دیے اور سنگر مشین چھوڑ کر اس تیزی سے بھاگا کہ دھاگہ کی گولی دکان کے اندر گر کر اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی دروازے کی ایک درز میں ٹوٹ گئی۔

تھارو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ پر دستخط کر دیے۔ پان شاپ کے مالک نے ایک ڈبیہ کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔

ایک گواہی بھی ڈلوا دو نا . . . خی خی . . . رسمیہ طور پر ضرورت ہوتی ہی ہے نا . . . . . خی خی . . . ."

اوسا کا فیئر کے منتظم کو لے آؤ۔

نثار وکے ہاتھ زیادہ کانپنے لگے۔ وہ بھی صمیم کی طرح معمر نظر آنے لگا۔ نثار وکھانستے ہوئے بولا۔

"مگر میں صمیم کے سامنے روپیہ لینا نہیں چاہتا۔"

پان شاپ کا مالک ڈرامائی انداز سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس نے سامنے لٹکتے ہوئے جھومروں کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"وہ صمیم کی بیوی کے ہیں۔"

اب نثار وکو پتا چلا کہ کیوں صمیم ایک ہفتہ میں ہی معمر دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے چپکے سے سند پر بھی دستخط کر دیے۔ پان ٹکٹ ہاتھ میں لیا اور کسی دوسرے دکاندار کی گواہی ڈلوا دی۔

پھر وہ پان شاپ کے پہیے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اپنے معمر اور دیانتدار چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھتے ہوئے پان شاپ کی سیڑھیوں پر سے اُترا۔ اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں —— کیونکہ وہ ایمان فروش اور بدقماش نہیں تھا۔

۲۱۔ اگست تک نثار وسوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ وہ اسی رسّی کی مانند ہو گیا تھا۔ جو جل جانے کے بعد بھی ویسی صورت رکھتی ہے۔ اُسے کسی طرف سے آمدنی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پر سکرات کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب کہ آدمی مایوس ہو کر آسمان کی طرف سر اٹھا دیتا ہے۔۔۔ ایمان دار کی خدا مدد کرتا ہے۔۔۔ ایمان کی کمائی۔۔۔ ایمان کی کمائی میں برکت۔۔۔ ایمان۔۔۔ لعنت!۔۔۔

اوسا کا فیئر کا منتظم تھارو کے پاس آیا۔ مایوسی کے انداز سے اس نے اپنے آپ کو ایک کرسی پہ گرا دیا اور بولا۔

"پان شاپ۔۔۔۔ میں ایک کیمرہ دکھائی دیتا ہے۔"

تھارو لال نے شرمندہ ہو کر سر اٹھایا اور ایک گہری نظر سے پان شاپ میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں ـــــ دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔ اور جھومروں کی ایک جوڑی بھی۔۔۔۔"

خان زادے نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کتنی میعاد ہے؟"

"۳۱۔ اگست۔۔۔۔ اور تمہاری؟"

"۳۱۔ اگست۔"

"کوئی سبیل؟"

"کوئی نہیں۔۔۔۔ اور تمہاری؟"

"اُوں ہوں۔"

اور دونوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے سر گرا دیا۔

منگل اشٹک

۱۲ کارتک ـــــ تلسی بیاہ کا تہوار تھا۔ اُسی دن نندہ اور روجے کا بیاہ ہوا۔

نندہ کے چہرے کی سپیدی اور سُرخی کسی رنگریز کے ناتجربہ کار شاگرد کے سرخ رنگے ہوئے کپڑے کی مانند تھی۔ اور وہ کسی مستور جذبے سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔ اگر اس خود فراموشی میں صرف اُسے اتنا سا خیال رہتا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور ایسی حالت میں اُسے کیا کرنا چاہیے۔ تو وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک مسلسل نظر سے جیوارام پروہت کی آٹے سے کھینچی ہوئی لکیروں یا خوبصورت روجے کے گورے گورے پاؤں کی طرف نہ دیکھتی اور نہ ہی وہ پھیریاں لیتے ہوئے قدرے سیدھی کھڑی ہو جاتی۔ کیونکہ قدیں وہ کچھ لمبی تھی اور سیدھی کھڑی ہونے سے وہ اپنے شوہر کے شانے سے بھی سر نکالتی تھی۔ بیاہ سے چند روز پہلے اس کی ماں نے اُسے پھیری کے موقع پر جھک کر چلنے کی سخت تاکید کی تھی مگر

نندہ تو یہ بھی بھول چکی تھی کہ بیاہ کے وقت اور بیاہ کے بعد جسمانی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے اُسے اپنے شوہر سے نیچا ہو کر رہنا پڑے گا۔

وجے کی حرکات بہت حد تک اس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں۔ اس کی بیتاب امنگیں آنکھوں کے راستے سے نہایت آوارگی کے ساتھ پل پل کر نندہ کی گوری گوری کلائیوں اور جسم سے جس کا چھپر پراپن سات پردوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ بے محابا لپٹ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وجے کسی گہرے خیال کے زیر اثر آنکھیں بند کر لیتا۔ جیسے مستقبل کی تمام مسرتیں سمٹ کر اس موجودہ لمحے میں مرکوز ہو رہی ہوں۔ اور جیوارام پروہت ان تمام جذبات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پنڈت جیوارام کے سامنے آج یہ تیسرا جوڑا تھا۔ جسے وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر رہا تھا۔ جیوارام نے بیاہ کا ساتواں منتر پڑھا ——— منتر پڑھتے وقت اُسے اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ بچپن ہی میں جب ردی شنکر چٹو پادھیائے نے اُسے منتر پڑھائے تو اس نے سب کچھ صحیح طور پر ایسا رٹ لیا تھا کہ تلفظ درست کرنے، لہجہ سلجھانے، آواز کو اونچا نیچا کرنے اور سُر بدلنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ یوں بھی یہ فن اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ وہ ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی مانند باقاعدہ طور پر اور معین جگہ پر ——— یعنی منگل، سنیچر، گنیش سے منسوب خشک آٹے کے خانوں میں پیسے رکھواتا۔ یا سیندور اور چاول پھینکواتا اور ایسا کرنے میں اُس سے بھول چوک کبھی نہ ہوتی۔

جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ایسی صحت سے وہ تمام ضروری رسوم سرانجام دیتے ہوئے تخیل میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔ اس دن وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک اُونچی

پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اُس کو ایک خوبصورت جھیل ـــــ اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آرہے تھے جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے جس پر بادشاہوں کو بھی رشک آئے اور اس سے پرے امراء کے محل جن میں وہ اپنے زر و دولت اور شان و شوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کناروں پر پانی میں ناگ پھنی اور کنول اُگ رہے تھے اور شیشم کے ایک کمزور سے درخت کے نیچے کوئی تارک الدنیا سنیاسی ترئی پھونک رہا تھا اور ترئی کی دلکش آواز اُس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آرہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر جیوا رام نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ اب اس نے دل میں کہا "ان ہاتھوں سے سینکڑوں بیاہ رچے۔ ان ہاتھوں نے سینکڑوں گھر آباد کئے، کئی عمر دوں کا ایک ایک لمحہ انبساط و نشاط میں سمو دیا۔ مگر میں خود ویسے کا ویسا کنوارا، خانہ برباد اور تنہائی کی ختم نہ ہونے والی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اس ناگ پھنی اور کنول کی مانند جو پانی میں اُگتے ہیں۔ مگر پانی سے آلودہ نہیں ہوتے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ بیاہ کا آخری منتر ـــــ منگل اشٹکا پڑھ رہا ہے اور پھر اشٹکا کا بھی آخری لفظ۔

"ساودھان۔" اُس نے خود کو کہتے ہوئے پایا۔

ساودھان کے لفظ کے ساتھ ہی بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں اور اس شور و غوغا نے جیوا رام کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا۔

"ساودھان" ـــــ جیوا رام نے ایک وقفہ پھر کہا اور ۔ ۔ ۔ تیسرا بیاہ پڑھنے کے بعد

جیوارام پنڈت کچھ تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ آمدنی کا لالچ اُسے اتنی محنت پر کم ہی مجبور کیا کرتا تھا۔ جیوارام نے اپنی بوجھل آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ آنکھوں کے نیچے بھاری بھاری تھیلے زیادہ بھاری اور سیاہ دکھائی دینے لگے۔ تھیلوں کو سکیڑ کر جیوارام نے ایک جمائی لی۔ نندہ کو منہ بسورتے دیکھا۔ کیونکہ وہ اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی تھی اور وجے کو مسکراتے ہوئے کیونکہ عنقریب وہ شادی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے والا تھا۔ کئی جمائیوں کے درمیان پروہت نے نہایت اختصار سے نندہ اور وجے کو خاوند اور بیوی کے جداگانہ فرائض سے آشنا کیا۔ اس کی تقریر کا لُبِ لباب یہ تھا کہ وہ آگ، پانی، ہوا، زمین اور آسمان کی گواہی میں ایک کئے جاتے ہیں۔ نندہ کو بتایا گیا کہ وہ ہر لحاظ سے شوہر سے کم رتبہ رکھتی ہے (اگرچہ جسمانی لحاظ سے وہ شوہر سے سر نکالتی ہے ——) وجے سے کہا گیا کہ اُسے چاہیے کہ وہ نندہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھے۔ پھر جیوارام نے وجے کو خاص طور پر برہمن، استری اور گائے کی حفاظت کرنے کی تلقین کی۔ شوراتری کی کتھا کا ایک حصہ سناتے ہوئے جیوارام نے کہا۔

. . . . وجے تم بھی پنڈت ہو۔ تم خود جانتے ہو گے۔ شکاری جو تیر مارنا چاہتا تھا۔ اسے جانوروں نے اپدیش دیا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل مارنے کے

۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن مارنے کے

۱۰۰ براہمنوں کا مارنا برابر ہے ایک استری مارنے کے

۱۰۰ استریوں کا مارنا برابر ہے ایک گربھ وتی (حاملہ) استری مارنے کے

۱۰ گربھ وتی استریوں کا مارنا برابر ہے = ایک گائے مارنے کے . . . .

اپنا کام نمٹا چکنے کے بعد جیوارام نے وہاں سے جانا چاہا۔ کس لئے؟ تنہائی کی نسبت
ں پھر گرفتار ہونے کے لئے، ویسا ہی برباد، کنوارا اور اچھوتا رہنے کے لئے۔ جیسے سخت
رش کے بعد ناگ پھنی اور کنول بن بھیگے سر اٹھائیں۔ اتنے بیاہ اس کے ہاتھوں سے
ئے۔ شادیوں کی اس موسلا دھار بارش میں بھی وہ ناگ پھنی کی مانند۔ . . .

اس وقت جیوارام کے تصور میں تندہ کا زہر بھول سکنے والا چہرہ، دھچے کی اوباش دآوارہ
ہیں اور کانوں میں براتیوں کا شور و غوغا اور گانے اور ہنسی مذاق کی آوازیں تھیں۔ اس کی
باقی طبیعت درحقیقت اُسے وہاں سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ طبیعت کیسی تھی ـــــ بات یہ تھی کہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہونے کی وجہ سے وہ باجے
بولک، گانے، مذاق اور چٹکیوں کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ بیاہ کے موقعہ پر دلہن کے چہرے
یالے رنگ بدلنا، نوشہ کی دزدیدہ نگاہیں، رخصت ہوتے وقت دلہن کا رونا، راگ
ب، ہنسی اور مذاق اور قہقہے اس کے دل میں ایک ہیجان بپا کر دیتے۔

خصوصاً بیاہ کے گیت سن کر تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا اور اپنے
بد کنوارے پن میں اُسے یہ محسوس ہونے لگ جاتا کہ وہ اس تمام شور و غوغا میں ایک
تلے، بے توقیر اور نامانوس شخصیت ہے۔ اُس کا یہ وہم دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ مگر
ہنگا پڑھنے اور سادھان کہہ چکنے کے بعد وہ فوراً ایک کونے کی طرف سرکنا شروع کر
پس قدر دلہن والے اور براتی اس کی توری کنارہ کشی دیکھتے، اُسی قدر اُسے بیٹھنے کے
مجبور کرتے۔ نہایت تکریم سے بلاتے، مگر جتنا کوئی اصرار کرتا۔ جیوارام کو اتنی ہی
ہ خفت ہوتی۔

ایک اور بات سے بھی اس کا اس قدر شرمیلا ہونا منسوب کیا جا سکتا تھا۔ شرمدہ سال

میں باتوں باتوں میں جیوارام نے مجھے بتایا کہ اس سال چیت کی پورنماشی کو ہنومان جینتی کے دن وہ چالیسویں سال میں قدم رکھے گا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ چیت کی پورنماشی کے دن ماروتی دیو یعنی ہنومان جی پیدا ہوئے تھے اور اس دن سے چالیس برس پہلے جیوارام کی پیدائش بھی انہیں ستاروں کے زیر اثر ہوئی ہوگی جس کے باعث اس کا جسم بھی تنومند تھا۔ اور طبیعت میں ہنومان جی کی سی بے چینی اور جوش تھا یعنی وہ ایک جگہ جم کر کم ہی بیٹھ سکتے تھے۔ فقط ایک بات تھی جو ہنومان جی میں نہ تھی اور وہ جیوارام میں تھی۔ اور وہ جیوارام کا شرمیلا پن اور غیر ضروری حجاب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہنومان جی کی پیدائش اور پنڈت جیوارام کی پیدائش میں کچھ وقت کا فرق پڑ گیا ہو اور جیوارام دوسری راس میں داخل ہو کر ہنومان جی سے تفریق پیدا کر چکا ہو اور کسی کمزور ستارے نے ہنومان جی کی سی بے باکی اور جرأت کو شرمیلے پن اور عجز بی میں بدل دیا ہو۔ بہر حال وہ اس وجہ سے بھی شرمیلا تھا کہ برسوں سے اکیلا رہتا آیا تھا۔ عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے وہ اس خوفناک حد تک کنوارا تھا کہ اگر بیمار پڑ جائے تو کوئی اُسے پانی کو بھی نہ پوچھے۔ چونکہ عورتوں کی بابت وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے ان سے ڈرتا تھا۔ وہ فقط یہ جانتا تھا کہ دنیا میں بہت سے جھگڑوں کی ابتدا عورت سے ہوا کرتی ہے۔ اس بات کا بھی اُسے علم تھا کہ عورت کی طبیعت (اس کی اپنی طبیعت کی مانند) جذباتی ہوتی ہے۔ مبہم اور شرمیلی ـــــ نامعلوم کس وقت کوئی بات اُسے بُری معلوم ہونے لگے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ جیوارام بُری بات کے معیارات سے ناواقف تھا۔ بیسیوں بار اس نے جی کڑا کر کے ایسی باتیں کی تھیں جو اس نے پہلے دل میں بُری محسوس کی تھیں۔ مگر کسی عورت نے بُرا نہ مانا۔ اور اب تو اس کی ہمت بڑھتی جاتی تھی۔

بیس برس سے چالیس برس کی عمر کے درمیان اُسے خیال آیا کہ وہ برہم چاریہ آشرم سے گرہست آشرم میں داخل ہو جائے۔ مگر برہم چاری پنڈت کا درجہ سماج میں کتنا اونچا ہوتا ہے اس کا اُسے غرور تھا۔ محض انگشت نمائی کے خوف سے اُس نے اپنے آپ کو روکے رکھا تھا کہ چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک یہ خیال بہت شکستہ ہو گیا تھا۔ کئی تحمیل انگیز بیاہوں نے اس کی ہٹ پر کاری ضرب لگائی تھی اور رفتہ رفتہ یہ اُس کے ذہن نشین ہو گیا۔ کہ چلتی پھرتی دنیا میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انگشت نمائی کے لئے وقت نکال سکے۔ ایسا خیال کرنا تو اپنے ہی من کی مایا ہے۔

گرہست کے قضیوں کا رونا اگر چہ رلنا شہر کے متعدد گرہستیوں سے انفرادی طور پر سنتے سنتے ناس کے کان پک چکے تھے۔ پھر بھی کسی ہونہار بیاہ کے اہتمام پر چند لمحے حیرت میں ڈوبے رہنے کے بعد جیوا رام منہ سے انگلی نکال کر سر کو ایک جھٹکا دیتا۔ جیسے کسی وکیل کو اپنے موکل کے بیان میں کوئی ایسا موافق نکتہ دکھائی دے۔ جس پر تمام مقدمہ گھوم جائے۔ وہ مشکوک انداز سے کہتا۔

"یہاں ——— یہ بات۔ بھئی آخر کچھ تو ہے جو رونے پیٹنے کے باوجود لوگ خوش رہتے ہیں۔ اس کش مکش اور بے قراری میں بھی کچھ لطف ضرور ہے۔ . . ."

مگر جب جیوا رام کے کان میں یہ الفاظ پڑتے کہ جیوا رام چالیس برس کا ہو چکا ہے۔ اور اس نے ابھی استری کا منہ تک نہیں دیکھا۔ تو جیوا رام کو اپنی فوقیت اور عظمت میں شک نہ رہتا۔ ایسی بات سن کر جیوا رام کے خوش آئند تخیل کی بنائی ہوئی بیاہ کی حسین عمارت طلبہ سمیت نیچے آ رہتی اور اسے از حد نواور زیادہ وسیع اور شاندار بنانے کے لئے ایک ہونہار بابیاہ، اس کی تمام رونق، ازدواجی رشتوں میں منسلک ہونے والے لڑکی اور

لڑکے کی غائبانہ کشش، ان کے والدین کی خوشی، اُسی راگ رنگ، اور ہنگامۂ باؤ ہو کی ضرورت ہوتی ——— اور نندہ اور وجے کا بیاہ پڑھ چکنے کے بعد ایک ایسی تقریب کے کنگرے جیوارام کے تخیل میں آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

چند دنوں کے بعد اوباش وجے جو رُلنا ہی میں رہتا تھا۔ اور دور نزدیک سے جیوارام کا رشتہ دار بھی تھا، آیا۔ اُس کی آنکھوں کے سُرخ ڈورے زیادہ پھول رہے تھے اور ان سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے جیسے اس کے اندر کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ بال شباب کی بھٹی تھی نا وہ ——— ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا لیتے ہوئے جیوارام سے کہا۔

"کہو دادا (بھائی) اتنے اداس کیوں ہو؟"

جیوارام نے اپنی افسردگی کو چھپا لیا اور بولا۔

"بھئی کل سے بیمار ہوں۔ بہت لاچار ہوں . . . بھائی کو خط لکھا ہے۔ بھاوج کو یہاں بھیج دے۔ مجھے تو یہاں پانی دینے والا بھی کوئی نہیں۔"

"ارے بھاوج؟ ——— ایک ہی کہی تم نے . . . وہ تو دن کے دن ہیں۔ آجکل چھٹائی میں سُر و ھنتی ہو گی۔ بیٹھو کی کمائی انہیں تک تو محدود ہے۔ اور آج کل تو بھاؤ پھلا لگتا ہوا اوپر جا رہا ہے۔ ایک پائی برس گیا تو اُن کے کوڑی دام نہیں۔"

دور سے نیلر تن آتا دکھائی دیا۔ نیل رتن مجسم شیطان تھا۔ وہ ہمیشہ بے وجہ ہنستا تھا۔ بے موقع ہنسی مذاق کیا کرتا۔ جب لوگ ہنستے تو وہ روتا۔ جب لوگ روتے تو وہ

ہنستا۔ یہ تعریف اولیاء کی ہوتی ہے۔ مگر وہ ولی بھی تو نہ تھا۔ اور یہی بات خطرناک تھی۔

نیل رتن سے ذکر کیا گیا تو وہ بولا۔

"ٹھیک ہے بھاوج کو عرض پڑی ہے کہ تمہارے ہاں آئے۔ اس کے تین بچے ہیں، تینوں کمسن، تینوں لڑکیاں۔ جن کا تن ڈھانپتے ہی آدھا دن گزر جاتا ہے — بھلا آئے تو ایک ایک کٹوری سے کم دودھ کسی کو کیا دو گے.... کیا کہتے ہو سیر؟.... ایں؟.... میں کہتا ہوں دو اڑھائی سیر سے کم نہ لگے گا۔ ذرا حساب تو لگاؤ.... اور پھر کئی قسم کا خرچ آپڑے گا۔ یوں دبو گے جیسے چوہا بلی کے نیچے دبا ہوتا ہے۔"

پھر اس بات کا رخ خود بخود پلٹ گیا۔ نیل رتن بولا۔

"کیوں وجے — بیاہ کیسا رہا۔ بیوی تو اچھی ہے نا؟"

جیوا رام نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی نندہ تو یوں بھی دیوی ہے — نری دیوی، وہ جہاں بھی جاتی گھر کو سورگ بنا دیتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو دادا۔" وجے نے کنوئیں کی چرخی کا سہارا ہٹاتے ہوئے کہا۔

"گرہست تو سچ مچ سورگ ہوتا ہے.... کیا بتاؤں؟ نندہ تو سچ مچ نندہ ہی ہے.... میں نے پچھلے جنم میں کوئی اچھے کرم کئے ہوں گے۔ جو مجھے نندہ ملی.... ایشور کرے میرا ایسا سکھ ہر ایک کو نصیب ہو۔"

اس کے بعد وجے نے اپنے آپ بتایا کہ نندہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی جب تک اسے نہ کھلائے۔ وہ کہیں باہر چلا جائے تو تمام دن انتظار رہا کرتا ہے.... دیر لگا کر آئے تو اسے روتا ہوا پاتا ہے۔ شکوے ہوتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس

کے پاؤں دبا تی ہے وغیرہ وغیرہ۔ شاید یہ خوش ہونے کی بات تھی۔ اس لئے نیل رتن نے افسردہ سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا جی ـــــ چند روز ـــــ ذرا ایک دو برس گزرنے دو.... ایک آدھ بچہ ہو جائے گا۔ پھر دیکھنا یہ گرہستی کس بھاؤ پڑتا ہے.... کدھر جاتے ہیں وہ چہچہاتے۔"

"خیر کچھ بھی ہو" جیوارام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "جس گھر میں نندہ ہی بیوی چلی جائے.... وہ گھر تو...."

پھر نا معلوم جیوارام کو کیا ہوا۔ فوراً ہی مغموم سامنہ بناتے ہوئے بولا۔

"وہ زندگی ہماری طرح تو نہیں کہ بیمار پڑ گئے تو کوئی پانی بھی نہ پوچھے۔ بھاوج کو لکھیں تو وہ دھانوں یا بچوں کی وجہ سے نہ آئے۔ اگر آئے تو دداڑھائی سیر دودھ وغیرہ ـــــ یہی اندازہ تھا نارتن؟"

وجے اور نیل رتن نے شدید طور پر جیوارام پنڈت کی مصیبت کو محسوس کیا۔ نیل رتن نے ایک خاص انداز سے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے بولا۔

"دادا تم جانتے ہو۔ میں کس لئے تمہارے پاس آیا ہوں؟"

"نہیں ـــــ میں کیا جانوں۔"

"میں تم سے منگل اشٹکا سیکھنے آیا ہوں، باقی کے سات منتر تو مجھے آتے ہیں۔ منگل اشٹکا پڑھتے وقت کچھ روانی نہیں پاتا ہوں۔"

"تم بھی پروہتوں کا کام کرنے لگے.... اپنا کام چھوڑ دیا تم نے؟"

"تمہیں سکھا دینے میں تامل ہی کیا ہے۔ ایک خاص بیاہ پر ضرورت ہے...."

پھر جیوارام کے قریب آتے ہوئے وجے نے کہا۔

"دادا! بات یہ ہے۔ ہمارے ہاتھ تلے ایک لڑکی ہے . . . نہایت سندر، ذرا چنچل ہے . . . تمہاری طرح ——— عورتیں ہوتی ہی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں۔ تمہارا اُس سے بیاہ ہو جائے۔ بیاہ میں ہی پڑھ دوں۔ اور زیادہ لاگ لپیٹ اور شور نہ ہو . . . گرہست میں تمہیں بہت سکھ ملے گا۔ تمہاری حالت کا اندازہ میں نے اسی دن لگا لیا تھا۔ جب تم میرا بیاہ پڑھ رہے تھے۔"

وجے اور نیل رتن جیوارام کے اثبات و نفی کا انتظار کرنے لگے۔

چند لمحات کے لئے خاموشی رہی۔

جیوارام کا جواب خاموشی تھا۔ جس کا مطلب تھا۔ نیم رضامندی۔

نیل رتن نے چپکے سے کہا۔

"دادا ——— اچھی بات ہے۔ وجے پنڈت ہی ہے نا۔ وہ منگل اشٹکا و شڈاشٹکا پڑھ لے گا۔ بہت شور مچائے بغیر بیاہ ہو جائے گا۔ سکھی رہو گے۔ تم جانو تمہارا کام . . . ہم بھلے کی کہتے ہیں ——— دن مت دیکھو۔ ۲۵۔ کارتک۔ بدھ وار، شبھ لگن، شبھ مہورت، بس منگل اشٹکا اور سادو ہاں۔"

ناگ پھنی اور کنول کو اپنی پتیاں بھیگتی ہوئی نظر آنے لگیں، جیوارام کی ذہنی تعمیر کے کنگرے آسمان سے باتیں کرتے کرتے بالکل آسمان سے جا ملے۔

جیوارام پروہت کے بیاہ کے لئے بہت ٹھاٹھ باٹھ کیا گیا۔ باجے بھی بجے اور ڈھولک بھی۔ نذاق بھی ہوئے اور قہقہے بھی بلند ہوئے۔ جیوارام کا دل بھی دھڑکا ———

اور بہت زور زور سے۔ فقط اتنی کسر تھی کہ چھاتی کی دیوار میں نہ ہوتیں تو کبھی کا اُچک کر باہر آ رہتا۔

وجے نے دیکھا۔ پنڈت جیوارام کی نظریں بھی آوارہ ہو چکی تھیں اور مچل مچل کر اپنی ہونے والی بیوی کی گوری گوری کلائی پر چمکتی ہوئی چوڑیوں اور جسم جس کا چھپر پراپن سات کپڑوں میں ملبوس ہونے پر بھی دکھائی دے رہا تھا کا جائزہ لے رہی تھیں اس کی زوجہ نندہ کی طرح لمبی تھی اور اپنے شوہر سے سر نکالتی تھی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی۔

وجے نے رسمیہ طور پر عہد کے لئے جیوارام کا ہاتھ اُس کی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دیا۔ اس پر گیلا آٹا رکھا اور ساتواں منتر پڑھ دیا۔ چاروں طرف سے چاول وجے کے آگے گرنے لگے۔

وجے ایک استادانہ طرز سے پیسے منگل، سنیچر، گنیش، وغیرہ کے خانوں میں رکھوا رہا تھا۔ کانپتے ہوئے جیوارام نے اشارہ سے وجے کو بلایا۔ منتر گنگناتے ہوئے وجے نے اپنا کان جیوارام کے منہ کے پاس کر دیا۔ جیوارام نے کہا۔

"بھیا ——— میرا دل بہت دھڑک رہا ہے۔۔۔ میں کانپ رہا ہوں۔ دیکھتے نہیں مجھے سردی لگ رہی ہے۔ نیل رتن سے کہنا مجھے ذرا تھامے رکھے۔"

وجے برابر منتر گنگناتا گیا۔ وجے کا ایک اور ساتھی بولا۔

"دادا ——— نیل رتن گیر ہٹ گیا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو رُلنا سے بہت دُور نہیں ہے۔ آتا ہی ہوگا۔"

"وجے ——— ٹھہرو۔" جیوارام نے آہستہ سے کہا۔ "منگل اشٹکا ابھی نہ پڑھو۔ مجھے سوچ لینے دو۔ میری عمر چالیس برس کی ہے۔ اور میں برہمچاری پنڈت ہوں۔۔۔"

"دبے نے دیکھا۔ جیوارام سچ مچ بیاہ کے لئے بہت معمر تھا۔ اس کے گلے میں خشکی پیدا ہو رہی تھی۔ لب سوکھ گئے تھے۔ جن پہ جیوارام دیوانہ وار زبان پھیر رہا تھا۔

دبے نے آہستہ مگر ایک حقارت آمیز آواز سے جیوارام سے کہا۔

"چھی چھی ——— تمہارے ایسے کمزور آدمیوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں دادا ——— دنیا ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا کرتی ہے۔"

جیوارام کے بس کی بات ہوتی تو وہ منگل اشٹکا کا جاپ ہونے سے پہلے ہی اپنے ایک برہمچریہ کو گرہست کی آلودگیوں سے بچانے نکلتا۔ مگر اس نے دیکھا کہ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اس کی ہونے والی بیوی نے بہت زور سے دبا رکھا تھا۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ وہ ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟ . . . شاید شرارت کے طور پہ چنچل تھی نا ——— جوانی تھی نا ——— عورت!

پھر جیوارام منگل اشٹکا کے جلدی جلدی پڑھے جانے کا انتظار کرنے لگا تاکہ وہ جلد ہی اس ذہنی کوفت سے نجات حاصل کر لے۔ اور اپنی ہونے والی بیوی کا چہرہ دیکھے اس کے تخیل کی مشین چلنے لگی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دلفریب پہاڑی پر کھڑا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں اس کو ایک خوبصورت نیلی جھیل ——— اس میں تیرتے ہوئے بجرے، اس کے کنارے پر لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، اور ساتھ ہی ماہی گیروں اور دہقانوں کے وہ جھونپڑے نظر آ رہے تھے۔ جن میں وہ لوگ ایسی مسرت سے سرشار تھے جس پہ بادشاہوں کو بھی رشک آئے۔ اور ان سے پرے امراء کے محل جن میں وہ زرد و ارغوان دشوکت کے باوجود غریبوں سے بھی زیادہ دکھی تھے۔ جھیل کے مشرقی کنارے پانی میں ناگ پھنی اور کنول اگ رہے تھے اور شیشم کے ایک پودے سے درخت کے

کوئی تارک الدنیا سنیاسی ترنی پھونک رہا تھا۔ اور ترنی کی دلکش آواز اس بات کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے نسلِ انسان ازل سے بھولتی چلی آ رہی ہے . . . .

——— فقط اب وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے بازو میں بازو ڈالے محوِ نظارہ تھی۔

پانی میں ناگ پھنی اور کنول تر بتر ہو رہے تھے۔

یکایک منگل اشٹکا نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کتنا خوبصورت پر معنی منتر ہمارے بزرگوں نے . . . .

"ساد دھان" کی آواز آئی اور لوگوں نے مبارکباد دی۔

دیے نے اپدیش دیا۔ بالکل جیوارام کی طرح ——— وجے نے آخر میں کہا۔

۱۰ بکریوں کا مارنا برابر ہے ایک بیل کے

۱۰۰ آدمیوں کا مارنا برابر ہے ایک براہمن مارنے کے

پاس ہی سے ایک شرارتی لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

ایک من برابر ہے چالیس سیر کے

ایک سیر برابر ہے سو چھٹانک کے

اور وجے نے گھورتے ہوئے کہا "ہست۔ ہشت

شام کو حجلۂ عروسی میں جیوارام نے اپنی دلہن کو گٹھڑی بنے ایک کونے میں بیٹھے دیکھا جیوارام کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اپنی بیوی کا منہ دیکھنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

"شاید یہ حرکت اُسے بُری لگے ——— جیوارام نے دل میں کہا "عورت ہے نا . . . ."

جیوارام نے جتنی دفعہ کوشش کی۔ اتنی دفعہ ہی ناکام رہا۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے کمرے میں اور بھی بہت سے آدمی ہیں۔ اُسے واہمہ گردانتے ہوئے جیوارام نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر روک لیا۔

"تمہارے ایسی کمزور طبیعت والے آدمی کو تو دنیا آڑے ہاتھوں لیتی ہے ....."

چھی چھی ـــــ وجے کے الفاظ جیوارام کے کانوں میں گونجنے لگے۔

جیوارام نے جب نہایت ہمت سے کام لے کر آناً فاناً دلہن کا منہ بے نقاب کیا تو دلہن دیوانی ہو کر تالیاں بجانے لگی۔ جیوارام کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیاہا ہوتے ہوئے بھی وہ کنوارا تھا۔ یا کنوارا ہوتے ہوئے وہ رنڈوا تھا یا..."

ـــــ دو چار پائی پر دلہن کی بجائے نہایت قیمتی کپڑوں میں ملبوس نیل رتن تالیاں بجا رہا تھا۔ اور باہر سے منگل اشٹکا کے اونچے اونچے جاپ کے درمیان بے تحاشا قہقہے بلند ہو رہے تھے!!

کوارنٹین

پلیگ اور کوارنٹین!

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کہر کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سُن کر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوفناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اُس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے اور یہی وجہ تھی کہ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لئے جو قدآدم اشتہار چھپوا کر دروازوں گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا اس پر نہ چوہا نہ پلیگ، کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے 'نہ چوہا نہ پلیگ، نہ کوارنٹین لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت

مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں۔ حالانکہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں۔ بلکہ وہ اس وسیع رقبہ کا نام ہے۔ جس میں متعدی وبا کے ایام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے از روئے قانون علیحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا کافی انتظام تھا، پھر بھی مریضوں کے کثرت سے وہاں آجانے پر اُن کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو چلتے پھرتے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا۔ اور کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا اور بغیر کسی کے مذہبی رسوم کا احترام کئے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یا رنگ دہم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لئے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اُسے چھپانے لگتے۔ تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لئے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کرواتے اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اسی وقت پتہ چلتا جب کہ جگر دوز آہ و بکا کے درمیان ایک لاش اُس گھر سے نکلتی۔

ان دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کر رہا تھا پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلط تھا۔ شام کو گھر آتے ہوئے میں ایک عرصہ تک کاربالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔ اگرچہ اس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہو گئی کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تحریر ہوتی اور بخارات اٹھ اٹھ کر دماغ کو جاتے تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کی مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں ـــــ اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا ..... پلیگ! اور پھر ـــــ کوارنٹین!

انہیں دنوں میں نوعیسائی ولیم بھاگر خاکروب جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا میرے پاس آیا اور بولا "بابو جی ـــــ غضب ہو گیا۔ آج ایک اسی محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔"

"کیس؟ ایمبولینس میں .....؟" میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"جی ہاں ..... پورے بیس اور ٹیک ـــــ انہیں بھی کوارنٹین (کوارنٹین) لے جائیں گے ـــــ آہ! وہ بیچارے کبھی واپس نہ آئیں گے؟"

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اٹھتا ہے۔ آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے اور پھر حسب ہدایت کمیٹی کی گلیوں میں اور نالیوں میں چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے۔ تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے تین بجے اٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اس محلہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے ان لوگوں کے

چھوٹے موٹے کام کاج کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر موت آئی ہو تو خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے بچ نہیں سکتا۔

ان دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ بھاگو سر اور منہ پر مٹھا سا باندھے نہایت انہماک سے بنی نوع انسان کی خدمت گذاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا علم نہایت محدود تھا تاہم اپنے تجربہ کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی ترکیب بتاتا۔ عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا۔ ایک دن میں نے اسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس دن جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا "بھاگو تمہیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟"

"نہیں بابو جی ——— بن آئی بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آپ اتنے بڑے حکیم ٹھہرے، ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی۔ مگر جب میری آئی ہوگی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا..... ہاں بابو جی ——— آپ جانے مانیں، میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں"۔ اور پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولا "کچھ کوئنین کی کہئے بابو جی ——— کرنٹین کی!"

"ہاں کرانٹین میں ہزاروں مریض آگئے ہیں۔ ہم حتی الوسع ان کا علاج کرتے ہیں۔ مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی نیادہ دیر ان کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے ان کے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمہاری طرح کوئی مریض کے منہ کے ساتھ منہ نہیں سہلاتا۔ نہ کوئی تمہاری طرح اتنی جان مارتا ہے..... بھاگو خدا تمہارا بھلا کرے جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو۔"

بھاگو نے گردن جھکا دی، اور منہ سے کے ایک پلو کو منہ سے ہٹا کر شراب کے اثر سے سرخ چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا "بابو جی! میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے یہ

یہ نکما تن کسی کے کام آجائے۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے، بابو جی بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونٹ ل، آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لئے آیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ پیار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو ——— میں سمجھتا ہوں ....."

میں نے بھاگو کی ہمت کو سراہنا چاہا۔ مگر کثرت جذبات سے میں رک گیا۔ اس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کو میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے بہت سے مریضوں کو بقید حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ان کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا۔ مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی اور ان کے منہ سے پیدا شدہ تعفن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری روح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

تاہم اس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا وہ میں نے بھاگو سے کرایا اور اس نے بلا تامل کیا ..... خود میں مریضوں سے دور دور ہی رہتا۔ اس لئے کہ میں موت سے بہت خائف تھا اور اس سے بھی زیادہ کوارنٹین سے!

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اس دن کوارنٹین میں چار سو کے قریب مریض داخل ہوئے اور لڑائی سو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ

جو مریضوں کی رفاہِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا۔ اس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانے سے اس کمرے میں چلا جاتا اور اس لکیر کو سو فی صدی کی طرف اوپر ہی اوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنونی کی مانند ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے، یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی اسے جمع کرتے ہوئے اس نے کہا "یسوعی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں ....."

بھاگو نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "خداوند یسوع مسیح کا شکر کرو بھائی ـــــ تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو"

"ہاں بھائی شکر ہے خدا کا ـــــ پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔ اگر میں کوارنٹین....."

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کی نسیں کھنچ گئیں۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بھاگو اس کی موت پر کھلائی

نہ دینے والے خون کے آنسو بہانے لگا۔ اور کون اس کی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر وزنالوں سے ارض و سما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لئے اس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کڑھتا تھا ـــــ ایک دن اس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہ کے کفارہ کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا "بابو جی ـــــ یہ کرسٹین تو دوزخ ہے دوزخ۔ پادری لالے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا....."

میں نے کہا "ہاں بھائی یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے ـــــ میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں..... میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔"

"بابو جی اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے..... آج ایک مریض ہو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے مُردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو میں نے اسے شعلوں میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔ میں نے کود کر اسے اٹھا لیا۔ بابو جی! وہ بہت بُری طرح جھلسا گیا تھا ـــــ اسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا ہے۔"

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اس پر زرد زرد پپڑی نظر آ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے لرز اٹھا میں نے پوچھا "کیا وہ آدمی بچ گیا ہے۔ پھر ـــــ؟"

"بابو جی ـــــ وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا جس کی نیکی اور شرافت (شرافت) سے دنیا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اتنے درد و کرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور

اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہ میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا شکریہ ادا کیا!"

"——اور بابو جی" بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا ہوگا—— اس کے بعد وہ مر گیا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں——اسے اسی وقت جل جانے دیتا۔ اسے بچا کر میں نے اسے مزید دکھ سہنے کے لئے زندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں، اب انہی جلے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں——"

اس کے بعد بھاگو کچھ بول نہ سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اس نے رکتے رکتے کہا

"آپ جانتے ہیں..... وہ کس بیماری..... سے مرا؟ پلیگ سے نہیں——کولیٹین سے——کولیٹین سے!"

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ و پکار شہر کی اس فضا میں جس میں کہ نصف شب کے قریب الو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے۔ ایک نہایت المناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح و سلامت لوگوں کے سینوں پر ہموں بوجھ رہتا تھا تو ان لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنہیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر کولیٹین کے مریض جنہیں مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو، اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اس چوٹی کو بھی

ڈبو دینے کی آرزو مند ہوں۔

میں اس روز توہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی ـــــ کیونکہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھا مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سونے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کوارنٹین میں پانسو مجھے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا "بابو جی ـــــ میری بیوی جاتی رہی گئی..... اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں..... خدا کے واسطے اسے بچاؤ..... اس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دودھ پیتا ہے، وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔"

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا، "اس سے پہلے کیوں نہ آسکے ـــــ کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟"

"صبح معمولی بخار تھا ـــــ جب میں کوارنٹین گیا....."

"اچھا ـــــ وہ گھر میں بیمار تھی۔ اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟"

"جی بابو جی ـــــ" بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا۔ "وہ بالکل معمولی طور پر بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دودھ چڑھ گیا ہے ـــــ اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں ـــــ اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے..... اور سینکڑوں مریض کوارنٹین میں لیے بس....."

"تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو ـــــ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمہارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزہ

بھگتنا ہی چاہیئے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں ....."

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا "مگر خداوند یسوع مسیح ....."

"چلو ہٹو ــــ بڑے آئے کہیں کے ــــ تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا ہے اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ــــ"

"مگر پادری لابے ....."

"چلو ــــ جاؤ ــــ پادری ل آبے کے کچھ ہوتے ....."

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا۔ میں غافل کہاں کا تھا جو بعد میں پشیمان ہو رہا تھا۔ میرے لئے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گذشتہ رویہ پر اظہار معذرت کرتے ہوئے اس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑتا دوڑتا بھاگو کے گھر پہنچا ..... وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے ــــ

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "اسے کہاں لے جا رہے ہو؟"

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا "کرسٹین ہیں ....."

"تو کیا اب تمہاری دانست میں کرسٹین دوزخ نہیں ــــ بھاگو؟ ....."

"آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا۔ بابو جی ــــ اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرا خیال تھا وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دوسرے مریضوں کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھوں گا۔"

"یہاں رکھ دو چارپائی..... ابھی تک تمہارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا؟..... احمق....."

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہدف دوا تھی میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا، بابوجی۔"

میں نے کہا "مجھے اپنے گذشتہ رویّہ پر سخت افسوس ہے بھاگو ـــــ ایشور تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ تمہاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔"

اسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو کہ میرے ہاتھ میں تھی مدھم ہو کر شانہ کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی۔ حسب معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا "بھاگو! بدنصیب بھاگو! تمہیں اچھی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے ـــــ آہ!"

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ نظارہ کتنا دلدوز تھا، جبکہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا... مگر اس سے اگلے روز میں نے اسے بیش از بیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا ـــــ اور اپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت

میں میں نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھروں سے، جو کہ بدرو ؤں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے یا غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھو ڈالا گیا تھا چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دئے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

شہر میں کاروبار نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی۔ سکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ احسانمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بوچھاڑ نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور ڈاکٹر مدعو کئے گئے وزیر بلدیات نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ میں صاحب صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا کیونکہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پرغرور نگاہ سے میں کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر ... بنی آدم کی انتہائی خدمت گذاری کے صلہ میں کمیٹی شکر گذاری کے جذبہ سے معمور ایک ہزار ایک روپے کی تھیلی بطور ایک حقیر رقم میری نذر کر رہی تھی۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میرے رفقاء کار کی عموماً اور میری خصوصاً تعریف کی اور کہا کہ گذشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تن دہی سے بچی ہیں ان کا شمار نہیں ہے

نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات، اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

وزیر بلدیات نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی توجہ اس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ افتاں و خیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں انہوں نے نقشہ میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرِ نگرانی چمن مریض رکھے گئے اور وہ تمام صحتیاب ہو گئے۔ یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیر بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین و آفرین کی آوازوں اور پُرشور تالیوں سے گونج اٹھا۔

انہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اٹھائی۔ صاحب صدر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے۔ بلکہ ان کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے، اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار ہوئے۔ میں اور میرے رفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی توجہ بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں انہی خوفناک مسکنوں میں گذاریں۔

اسی دن جلسہ کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُرغرور گردن کو اٹھائے

ہوئے ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا ناچیز ہدیہ ایک ہزار ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا تو مجھے ایک طرف سے آہستہ سی آواز سنائی دی۔

"بابو جی..... بہت بہت مبارک ہو۔"

——— اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت وہی پرانا جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منڈا سا کھول دیا۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

"تم ہو؟..... بھاگو بھائی!" میں نے بمشکل تمام کہا..... "دنیا تمہیں نہیں جانتی، بھاگو تو نہ جانے..... میں تو جانتا ہوں۔ تمہارا یسوع تو جانتا ہے..... پادری ل آبے کے بے مثال چیلے..... تجھ پر خدا کی رحمت ہو.....!"

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھنچ گئی۔ ہاروں کے بارِ گراں سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی اور ——— اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر شناس دنیا کا ماتم کرنے لگا!

تلادان

دھوبی کے گھر کہیں گدھا چاچھو کر پیدا ہو جائے تو اس کا نام بابو رکھ دیتے ہیں ——
سادھو رام کے گھر بابو نے جنم لیا اور یہ صرف بابو کی شکل و صورت پر ہی موقوف نہیں تھا جب
وہ بڑا ہوا تو اس کی تمام عادتیں بابوؤں جیسی تھیں۔ ماں کو حقارت سے اسے لیا اور باپ کو چل بے
گنوا اس نے نہ جانے کہاں سے سیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی رعونت سے بھری ہوئی آواز پھونک پھونک
کر پاؤں رکھنا، ہونٹوں سمیت چہرے میں چلے جانا، دودھ کے ساتھ بالائی نہ کھانا سبھی صفات
بابوؤں والی ہی تو تھیں۔ جب وہ تحکمانہ انداز سے بولتا اور چل بے کہتا تو سادھو رام سہم جاتی
... بالکل بابو۔ کہہ کر اپنے زرد دانت نکال دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔
بابو جب سکھ نندن، امرت اور دوسرے امیر زادوں میں کھیلتا تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ یہ
اس ماحول کا منکا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایشور نے سب جیو جنتو کو منکا کر کے اس دنیا میں

بھیج دیا ہے۔ کوئی بولی ٹھولی نہیں دی۔ یہ ناداری، لکھ پتی، مہاراجن، بھنوٹ، ہریجن، لنگر افریکا سب کچھ بعد میں لوگوں نے خود ہی ایجاد کیا ہے۔

بدھئی کے پردادا میں سکھ نندن کے ماں باپ کھاتے پیتے آدمی تھے اور ساوھو رام اور دوسرے آدمی انہیں کھاتے پیتے دیکھنے والے۔۔۔۔ سکھ نندن کا جنم دن آیا تو پرواہ کے بڑے بڑے نیتا گگن ویر بھنڈاری، ڈالچند، گنپت، مہاراجن وغیرہ کھانے پر مدعو کئے گئے۔ ڈال چند اور گنپت مہاراجن دونوں موٹے آدمی تھے اور قریب قریب ہر ایک دعوت میں دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ابھری ہوئی توند کے نیچے پتلی سی دھوتی میں لنگوٹ، بھاری بھرکم جسم پر ہلکا سا جنیو، لمبی چوٹی، چندن کا ٹیکا دیکھ کر بابو جلتا تھا اور بھلا یہ بھی کوئی جلنے کی بات تھی۔ شاید ایک ننھا سا نازک بدن بابو بننے کے بعد انسان ایک بدنصیب بے ڈول سا پنڈت بننا چاہتا ہے۔۔ اور پنڈت بننے کے بعد ایک پست ضمیر گناہگار انسان اور اچھوت۔۔۔۔ ڈال چند اور گنپت مہاراجن کے جیون کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ انسانی فطرت کی نیرنگی ہر جگہ کرشمے دکھاتی ہے۔

بابو نے دیکھا جہاں بھنڈاری اور مہاراجن بھنوٹ آئے ہوئے تھے۔ وہاں عمدہ مراسن، ہر کھو، بڑی والا کارندے اور دو تین جھوٹی جلیبیں اور دو دونے اٹھانے والے جھیور بھی دکھائی دے رہے تھے۔ جب دس پندرہ آدمی کھانے سے فارغ ہو جاتے تو جھیور پلیٹوں اور دونوں سے بچی کھچی چیزیں ایک جگہ اکٹھی کرتے۔ جھیوارنی صحن میں ایک جگہ چادر کا ایک پلو بچھائے بیٹھی تھی۔ وہ سب بچی کھچی چیزیں، حلوہ، دال، توڑے ہوئے لقمے، پکوڑیاں ملے ہوئے آلو مٹر اور پاؤل اس بچی ہوئی چادر یا ایلومینیم کے ایک بڑے سے زنگ آلود تسلے میں ڈال دیتے۔ اس کے سامنے سب چیزیں کھچڑی دیکھ کر بابو نہ رہ سکا۔ بولا:

"جمعدارنی ـــــ کیسے کھاؤ گی یہ چیزیں؟"

جمعدارنی ہنس پڑی، ناک سکیڑتی ہوئی بولی: "جیسے تم روٹی کھاتے ہو۔"

اس عجیب اور سادہ سے جواب سے بابو کی رعونت کو ٹھیس لگی۔ بولا: "کتنی ناسمجھ ہو تم..... اتنی سی بات نہ سمجھیں۔ تبھی تو تم لوگ جوتوں میں بیٹھنے کے لائق ہو۔"

حلالخوری کی اکڑ زبان زدِ عوام ہے۔ ماتھے پر تیور چڑھاتے ہوئے جمعدارنی بولی:

"اور تم تو عرش پر بیٹھنے کے لائق ہو..... ہے نا؟"

"یونہی خفا ہو گئیں تم تو۔" بابو بولا: "میرا مطلب تھا سالن میں حلوہ، پکوڑیوں میں آلو مٹر، پلاؤ میں فرنی، یہ تمام چیزیں کھچڑی نہیں بن گئیں کیا؟"

جمعدارنی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بھنڈاری اور ضابرا ہمن کو اچھی جگہ پر بٹھایا گیا۔ وہ سادھوؤں کی سی رودرکش کی مالا گلے میں ڈالے کنکھیوں سے بار بار عمداں اور جمعدارنی کی طرف دیکھتے رہے۔ عمداں جمعدارنی کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ہر کھوہ، ہڑی، داوا، دھوپ میں بیٹھے ہوئے کھاتے پیتے آدمیوں کا منہ دیکھ رہے تھے۔ کب وہ سب کھا چکیں تو انہیں بھی کچھ میسر ہو۔ بابو نے دیکھا عمداں کے قریب ہی ایندھن کی لوٹ میں اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی۔ اس کے قریب برتن مانجھنے کے لئے راکھ اور نیم سوختہ اوپلے پڑے تھے اور راکھ سے اس کا لہنگا خراب ہو رہا تھا۔ قمیص بھی خراب ہو رہی تھی۔ بنیر قمیص کی تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ تو کسی کی تھی اور دھلنے کے لئے آئی تھی۔ ایک رفعہ دھو کر بابو کی ماں نے پہن لی تو کچھ بگڑا نہیں گیا۔ پرماتما بھلا کرے بابوؤں کا کہ انہی کی مہربانی سے ایسا موقع میسر ہوا۔

جب اپنے دوست سکھی نندن کو ملنے کے لئے بابو نے آگے بڑھنا چاہا تو ایک شخص نے اسے چپت دکھا کر وہیں روک دیا اور کہا: "خبردار ادھوبی کے بچے..... دیکھتا نہیں کدھر

سارا ہے؟" بابو تھم گیا۔ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ لڑے یا نہ لڑے۔ جھبرو کا تنومند جسم دیکھ کر دب گیا اور یوں بھی وہ ابھی بچہ تھا۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس نے ایک اُداس اُچٹتی ہوئی نظر سے اچھی جگہ بیٹھ کر کھانے والوں اور نیم سوختہ اوپلوں کی راکھ اور جوتوں میں پڑے ہوئے انسانوں کو دیکھا اور دل میں کہا۔ اگرچہ سب ننگے پیدا ہوئے ہیں مگر ایک کارندے اور براہمن میں کتنا فرق ہے۔

پھر دل میں کہنے لگا۔ سکھ نندن اور بابو میں کتنا فرق ہے۔ اور ہلکی سی ایک ٹیس اس کے کلیجہ میں اُٹھی۔ حقیقت تو بابو کے سامنے تھی۔ مگر اتنی مکروہ شکل میں کہ وہ خود اسے دیکھنے سے گھبراتا تھا۔ بابو دل ہی دل میں کہنے لگا "ہم لوگوں کے وجود ہی سے تو یہ لوگ جیتے ہیں۔ دن کی طرح اُجلے اُجلے کپڑے پہنتے ہیں۔۔۔۔۔۔" دراصل بابو کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہی پکوڑیوں، حلوہ مانڈے کے خیال میں ——— مگر وہ حقیقت تو کیا وہ اپنے دبدبے سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ مگر گرم گرم پوریوں کی صبر آزما خوشبو اس کے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر عمداں پر پڑی۔ عمداں کی نظر بھی ٹوکری میں گھی میں بسی ہوئی پوریوں کے ساتھ ساتھ جاتی تھی جب سکھ نندن کی ماں قریب سے گزری تو اس کو متوجہ کرنے کے لئے عمداں بولی:

"بھجانی۔۔۔۔۔۔ ذرا حلوائی کو ڈانٹو تو۔۔۔۔۔۔ اسے دیکھتیں نہیں، کتنا گھی بہہ رہا ہے جمین (زمین) پر"۔

بھجانی کڑک کر بولی:

"ارے او کشنو۔۔۔۔ حلوائی کو کہنا۔ ذرا پوریاں کڑاہی میں رہنے رکھے"۔

بابو ہنسنے لگا۔ عمداں کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ بابو جانتا تھا کہ عمداں وہ سب باتیں محض اس وجہ سے کر رہی ہے کہ اس کا اپنا جی پوریاں کھانے کو بہت چاہتا ہے۔ گو بھجانی کی توجہ کر کھینچنے

والے فقرے سے اس کی خواہش کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ متعجب تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس طرح اس نے عمران کے ان غیر متعلق الفاظ میں چھپے ہوئے اصلی مطلب کو پا لیا ہے۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ اس کی خاموشی میں کوئی اس کی بات کو پا لے۔ آخر خاموشی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔

اس وقت سکھ نندن ٹل رہا تھا۔ خوبصورت تراشوں کے ایک پلڑے میں بیٹھا ہوا دل ہی دل میں مسکراتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف گندم کا انبار لگا تھا۔ گندم کے علاوہ چاول، اسمتی، چنے، الاؤ، مونگ پھلی اور دوسری اس قسم کی اجناس بھی موجود تھیں۔ سکھ نندن کو تول تول کر لوگوں میں اجناس بانٹی جا رہی تھیں۔ بابو کی ماں نے بھی لیکھا پایا۔ اسے گندم کی دھڑی مل گئی۔ وہ سکھ نندن کی درازی عمر کی دعائیں مانگتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بابو نے نفرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو تمہیں اتنی کپڑوں کی دھلائی پر قناعت ہی نہیں تھی تو ہر ایک کی میل نکالنے کا کام ایشور نے تمہارے سپرد کر دیا ہے اور تم بھی چھوٹی کی طرح جوتوں میں بیٹھنے کے لئے تو ہر تمہاری کوکھ سے پیدا ہو جانے والے بابو کو چھاتی دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ آگے بڑھنے پر لوگ اسے چھپتا دکھا لیتے ہیں۔ تو نے اپنی یہ پھٹی ہوئی ساری قناعت آنکھیں گندم سے نہیں پتھر کی مٹی سے پر ہوں گی۔ قریب سے ماں گذری تو بابو بولا "ارے بڑا"

پھر سوچنے لگا۔ رام جانے میرا جنم دن کیوں نہیں آتا۔ میری ماں مجھے کبھی نہیں تولتی۔ جب سکھ نندن کا اس کے جنم دن کے موقع پر تول کر اجناس کا دان کیا جاتا ہے تو اس کی سبھی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ اسے سردی میں برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی اور گرمی میں بھیجا جلا دینے والی دھوپ میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ بالوں میں لگانے کے لئے تیل

لکھنؤ سے منگوایا ہوا آملے کا تیل ملتا ہے جیب پیسوں سے بھری رہتی ہے۔ بخلاف اس کے ہیں تمام دن صابن کی جھاگ بناتا رہتا ہوں۔ سکھ نندن اس لئے صابن کے بلبلوں کو پسند کرتا ہے کہ وہ بلبلے اور ان میں چمکنے والے رنگ اسے ہر روز نہیں دیکھنے پڑتے۔ یوں کپڑے نہیں دھونے ہوتے۔۔۔۔ سکھی کی دنیا کو کتنی ضرورت ہے۔ خاص کر اس کے ماں باپ کو۔۔۔۔ میرے ماں باپ کو میری دنیا بھی ضرورت نہیں۔ ورنہ وہ مجھے بھی جنم دن کے موقع پر یونہی تو نہ ٹلتے۔ اور جب سے سکھی پیدا ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ کہتے ہیں بلا ضرورت دنیا میں بھی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ یہ ہاتھ جو مالی کے کندھے لگ رہا ہے۔ بظاہر ایک فضول سا پودا ہے جب اس کی بھیجا بنتی ہے تو مزا ہی آجاتا ہے۔۔۔۔۔ اور پوریاں!

بابو کی ماں نے آواز دی:

"بابو۔۔۔۔ ارے او بابو!"

اس وقت سکھ نندن بابو کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اب بابو کو امید بندھی کہ وہ غضب ضیافت اڑا لے گا۔ بابو اس چھپنے والی دھوپ کو بھی بھول گیا جو برسات کے بعد تھوڑے عرصہ کے لئے نکلتی ہے۔ اور اسی عرصہ میں اپنی تب و تاب ختم کر دینا چاہتی ہے۔ اس نے ماں کی آواز پر کان نہ دھرا۔ اور کان دھرتا بھی کیوں؟ ماں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ضرورت ہوتی تو وہ اس کا جنم دن نہ مناتی۔ وہ تو شاید اس دن کو نحوست ہو گی جس دن وہ پیدا ہو گیا۔۔۔۔ اگرچہ ہاتھ کی بھیجا بڑی دلکش دلربا ہوتی ہے۔

"بابو۔۔۔۔ ارے او بابو کے بچے! آتا کیوں نہیں؟" بابو کی ماں کی آواز آئی۔

"ماں جاؤ۔۔۔۔ ابھی میں نہیں آسکتا۔" سکھ نندن نے کہا اور پھر ایک مغرورانہ انداز سے ٹ اور صابن کی طرف دیکھتا ہوا بولا: "کل آتا بھائی۔۔۔۔ دیکھتے نہیں ہو آج

مجھے فرصت ہے؟ جاؤ۔"

عورتوں کو پوریاں مل گئی تھیں۔ وہ آپس کو فرشی سلام کر رہی تھی۔ بابو نے سوچا تھا کہ شاید مسکراتا ہوا سنگھ نندن اس کی خاموشی میں اس کے من کی بات پا لے گا۔ مگر سنگھ نندن کو آج بابو کا خیال کہاں آتا تھا۔ آج ہر چھوٹے بڑے کو سکھی کی ضرورت تھی لیکن سکھی کو کسی کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی عظمت اور بابو کے سادہ اور بوسیدہ ٹاٹ کے سے کپڑوں کو دیکھ کر شاید وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اپنی عدیم الفرصتی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے گویا بابو کی رہی سہی عزت کوٹھی میں ملا دیا۔ پھر بابو کی ماں کی کرخت آواز آئی:

"بابو..... تیرا ستیاناس، طوبیٰ (طاعون) مارے..... گھس جائے تیرے پیٹ میں مانا کالی..... آتا کیوں نہیں۔ دو سو کپڑے پڑے ہیں..... لمبر گیرنے والے ہیں تو رو رہی ہوں تیری جان کو....."

بابو کو یہ محسوس ہوا کہ نہ صرف سنگھ نندن نے اس کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے اور وہ اس کے ساتھ کبھی نہیں کھیلے گا۔ بلکہ اس کی ماں جس کے پیٹ سے وہ ناحق پیدا ہوا تھا، وہی عورت جس سے اسے دنیا میں سب سے زیادہ پیار کی توقع ہے وہ اس سے ایسا سلوک کرتی ہے۔ کاش! میں اس دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر ہوتا تو یوں بالغ ہوتا۔ میری مٹی یوں خراب نہ ہوتی۔ آخر میں بھی ہے شکل اور عقل میں بڑھ چڑھ کر نہیں؟

سنگھ نندن کے جنم دن کو ایک ہفتہ ہو گیا۔ نلادان میں آئی ہوئی گندم پسی پس کر اس کی روٹی بنی۔ بابو کے ماں باپ نے کھائی۔ مگر بابو نے دو روٹی کھانے سے انکار کر دیا۔ بابو نے نلادان کا آٹا گھر میں سادہ روٹی اپنے چچا کے ہاں کھاتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس طرح مانگے تانگے کی چیزیں کھا کھا کر اس کے ماں باپ کی ذہنیت غلامانہ ہو گئی ہے وہ بھی کھا کر

اس میں بھی وہ بات آجاتی ہے۔ گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی روٹی سے تو دودھ ٹپکتا ہے مگر حرام کی کمائی سے خون ..... اور غلامی خون بن کر اس کے رگ و ریشہ میں سما جائے، یہ کبھی نہ ہوگا۔ سادھو رام حیران تھا۔ بابو کی ماں حیران تھی۔ بابو جس پر اس کی روٹی کا بوجھ جیسا پڑ گیا تھا۔ حیران تھے۔ بچی ناک بھوں چڑھاتی تھی اور جب گھر میں اس انوکھے بائیکاٹ کا چرچا ہوتا تو سادھو رام یک دم کپڑوں پر لنگر گیر نے چھوڑ دیتا اور نہ روز روانت نکالتے ہوئے کہتا:

"ہی ہی ..... بابو ہے نا"

شکر نندن نے اب بابو میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھی۔ بابو جس کا کام سے جی اچاٹ رہتا تھا۔ اب دن بھر کھاٹ پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا۔ بابو اب اس کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ ہر پانکھ تالاب کے کنارے ایک بڑی سی کرکٹ جیسی پر وہ اداس اس کے دو ایک ساتھی سکول کے وقت کے بعد کان پتہ کھیلا کرتے تھے۔ اب وہ جگہ بالکل سونی پڑی رہتی تھی۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک سادھو جن کی کٹیا میں بچے اپنے بستے رکھ دیتے تھے۔ کبھی کبھی چرس کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے پوچھ لیتے "بیٹا! اب کیوں نہیں آتے کھیلنے کو" اور سکھی نندن کہتا "بابو ناراض ہو گیا ہے بابا ....." پھر وہ تاجی ہنستے اور چرس کا ایک دم لگانے والا کش لگاتے اور کھانستے ہوئے کہتے:

"اوہو ہو ..... ہوں ..... وہ رہے بچے ..... اخر بابو جو ہوا نا"

اس وقت سکھی نندن غور سے کہتا "ہوا کیا ہے بابا تو اکثر کہا کرے ..... اس کی اوقات کیا ہے دھوبی کے بچی"

..... مگر بچوں کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے کوئی نہ کوئی چاہیے کھیل میں کسی طرح کی

ذات پات اور درجہ کی تمیز نہیں رہتی۔ حقیقت میں چند ہی سال کی تو بات تھی جب کہ یہ لڑکے
نئے نئے پیدا ہوئے تھے اور اس وقت تک انہیں ناواقف لکھ پتی مہاراجوں کے گھروں میں
اور اس قسم کی فضول باتوں کے متعلق خیال آرائی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

لکھ نندن اپنی تمام مصنوعی عظمت کو کینچلی کی طرح اتار پھینک بابو کے ہاں گیا۔ بابو
اس وقت دن بھر کام کر کے تھک کر سو رہا تھا۔ ماں نے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا "بیٹا..... اب
کھیلنے کبھی نہ جاؤ گے کیا؟ کسی آیا ہے۔" بابو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ پڑوسیوں کے بچے اس نے
بہت سے پہلے کچھ اور اچھے اچھے کپڑے دیکھے۔ کپڑے جو کہ پیدائش ہی سے ایک
لکھ نندن اور بابو میں امتیاز و تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں..... بابو چارپائی پر سے فرش پر
بچھے ہوئے کپڑوں پر کود پڑا۔ دل میں ایک لطیف گدگدی سی پیدا ہوئی۔ کئی دنوں سے
وہ کھیلا نہیں تھا اور اب شاید اپنی اکتفائی روحانیت پر پچھتا رہا تھا۔ بابو کا جی چاہتا تھا کہ
پھاٹک کر باہر سے باہر چلا جائے اور سکھی سے لپٹ کر..... اور کیا اندر کی الجھن
کے لئے محبت کپڑوں کی حد سے نہیں بڑھ جاتی؟ کیا سکھی کو کچھ نہیں آتا تھا؟ بابو چاہتا
تھا کہ وہ دل لگائی رہے۔ سب کپڑے اتار کر ایک سے ہو جائیں اور خوب کھیلیں۔ اب
برآمدے میں کبوتروں کے کابک کے پیچھے جالی کے درمیان میں سے بابو کی نظر سکھی پر پڑی
جو کہ امید لگائے اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کیا یک بابو کو سکھی کے جنم دن
کی بات یاد آ گئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ کبوتروں کی جالی میں اسے بہت سی چیزیں دکھائی دیتی
تھیں اور بہت سے سراچ انکھ اور دیسی قسم کے کبوتر گھنٹوں گھوں گھوں کرتے ہوئے اپنی گردنیں
کو پھلا رہے تھے۔ ایک زرد پھول کبوتر مادہ کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ بابو نے اپنی چارپائی کو
کھینچ لیا اور گھوں گھوں کی سی آواز پیدا کرتا ہوا چارپائی پر واپس جا لیٹا۔ پھر اسے خیال آیا۔

مگر دھوپ میں کھڑا جل رہا ہے۔ مگر پھر وہ ایک فیصلہ کن بالآخر عمل مرتب کرتے ہوئے چارپائی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ آخر وہ بھی تو کتنا ہی عرصہ اس کے گھر کے صحن میں برسات کی چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہا تھا اور اس نے اس کی کوئی پروا نہ کی تھی..... اب وہ آئے گا تو اپنے گھر میں۔

"اسے کہہ دو..... وہ نہیں آئے گا ماں..... کہو اسے سفر صحت نہیں ہے خرچ" بابو نے کہا۔

"شرم تو نہیں آتی تجھے" ماں نے کہا "اتنے بڑے سیٹھوں کا لڑکا آوے، تجھے بلانے کے لئے اور تو یوں پڑا رہے..... گدھا!"

بابو نے کنپٹیاں ہلاتے ہوئے کہا "میں نہیں جانے کا ماں!"

ماں نے بڑھ کر کہا تو بابو بولا "سچ سچ کہہ دوں ماں۔ میں جانتا ہوں، میری کسی کو بھی ضرورت نہیں..... واویلا کرو گی تو میں کہیں چلا جاؤں گا۔"

ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس وقت بھی بلند آواز سے رونے لگی اور ماں اسے دھیرے چلانے میں مشغول ہو گئی۔

بڑھیا کے پردادا میں سیتلا (چیچک) کا زور تھا۔ پرانی عورتیں ہندیوں کی طرح اپنے اپنے بچوں کو گلیوں سے لگائے پھرتی تھیں۔ پڑوسن کی دہلیز تک نہیں پھاندتی تھیں۔ کہیں بچہ نہ پکڑ لیں۔ اور سیتلا ماتا تو یوں بھی بڑی غصیلی ہیں..... ڈال چند کی لڑکی، جہاں آرا جس کے دو بچے سب کو سیتلا ماتا نے درشن دیا۔ ان کی ماتیں گھٹنوں ان کے سرہانے بیٹھ کر سچے مرتبے کے ہار، کنگن کر گوری میا گاتی رہیں اور دیوی ماتا سے پرارتھنا کرتی رہیں کہ ان پر اپنا غصہ نہ نکالے۔ جب بچے راضی ہو جاتے تو مندر میں ماتھا ٹیکنے کے لئے لے جاتیں۔ ماتا تو

ہر ایک قسم کی خواہش پوری کرتی تھی۔ جب سیتلا کا غصہ ٹلا اور بخار کم ہوئی تو پرواؤں نے سیتلا کی مورتی بنائی۔ اسے خوب سجایا۔ سکھی نندن کے باپ نے سونے کی مالا سیتلا ماتا کے گلے میں ڈالی۔ سب نے مل کر عزت و تکریم سے ماتا کو مندر سے نکالا اور ایک سجی ہوئی ڈولی میں براجمان کیا اور ڈولی کو کھینچتے ہوئے گاؤں سے باہر چھوڑنے کے لئے لے گئے۔ پرواؤں کے سب بچے بوڑھے جلوس میں اکٹھے ہوئے ڈولی کی کمر تالیں اڈھل ڈھمکے دیتے جا رہے تھے۔ لوگ چاہتے تھے کہ کریہ دیوی ماتا کو ہرپا کے تالاب کے پاس مہاتما جی کی کٹیا کے قریب ان ہی کی نگرانی میں چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ماتا اس گاؤں سے کسی دوسرے گاؤں کا رخ کرے۔ دیوی ماتا کو خوشی خوشی روانہ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ ان پر آنچ نہ آئے۔ سکھی بھی جلوس کے ساتھ گیا۔ بابو بھی شامل ہوا۔ نہ بابو کو سکھی کے بلانے کی جرأت پیدا ہوئی۔ نہ سکھی کو بابو کے بلانے کی۔ ہاں کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔

ہرپا کے تالاب کے پاس ہی دھوبی گھاٹ تھا۔ ایک چھوٹی سی نہر کے ذریعہ تالاب کا پانی گھاٹ کی طرف کھینچ لیا جاتا تھا۔ گھاٹ کافی بہت لمبا چوڑا۔ قریب کے قصبوں میں سے دھوبی کپڑے دھونے آیا کرتے تھے۔ دیوی گھاٹ پر بابو اور اس کے ساتھی بنا باپ کا وہی ایک گانا، اسی پرانی تال سے گاتے ہوئے کپڑے دھوئے جاتے۔ ایک دن گھاٹ پر سارا دن بابو سکھی کے بغیر شدت کی تنہائی محسوس کرتا رہا۔ کبھی کبھی اکیلا ہی کپڑوں چل کے بل کھاتے ہوئے تنوں پر چڑھ جاتا اور اتر آتا۔ گویا سکھی کے ساتھ کا کھیل کھیل رہا ہو۔ کھیل میں لطف نہ آیا تو وہ اینٹوں کے ڈھیر میں رکھی ہوئی سیتلا ماتا کی مورتی کو دیکھنے لگا اور پوچھنے لگا۔ آیا وہ اس گاؤں سے چلی گئی ہے یا نہیں۔ ماتا کچھ کر دیتی تو نکلی نہ ملا

دکھائی دیتی تھیں۔ شام کو بابو گھر آیا تو اسے ہلکا ہلکا تپ تھا جو کہ بڑھتا گیا۔ بابو کو اپنی شادی یاد آ گئی۔ ایک دفعہ بابو کو ہوش آیا تو دیکھا ماں نے مویشیوں کا ایک باڑا اس کی چارپائی پر رکھ لیا تھا تم بھی ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا گھڑا تھا۔ گھڑے کے منہ پر بھی مویشیوں کے بال پڑے تھے اور ماں ایک نیا خریدا ہوا پنکھا ہلکے ہلکے ہلا کر مزے میں گنگنا رہی تھی پنکھا مرتے ہوئے آدمی کی نبض کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور اس پر سرخ پھول کاڑھے ہوئے بابو کی لمبی داڑھی کی جھریوں کی طرح لٹک رہے تھے اور یہ سامان سب کچھ ماں کی محنت کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ بابو نے اپنی پلکوں پر بوجھ محسوس کیا۔ اسے تمام بدن پر کانٹے چبھ رہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہو۔

دو تین دن تو بابو نے پہلو تک نہ بدلا۔ ایک دن ذرا افاقہ سا ہوا۔ صرف اتنا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ماں اور اس کی ماں دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹا ماں نے ناک پر دوپٹہ لے رکھا تھا۔ دراصل وہ دروازے میں اس لئے بیٹھے تھے کہ کہیں بابو نہ پکار لیں۔ مگر بابو نے سمجھا آج ماں لوگوں کا ضرور ٹوٹا ہے اس نے دل میں ایک خوشی کی لہر محسوس کی۔ ایک چھلنی ہی سادھو رام کو بہت سی باتیں بتا رہے تھے۔ انہوں نے ناریل بنانے کی منگوائی۔ سادھو رام کبھی کبھار اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیتا اور کہتا:

"بابو..... او بابو..... بیٹا بابو"

جواب نہ ملتا تو ایک دھماکا اس کے کلیجے میں لگتا اور وہ گم ہو جاتا۔

بابو نے بمشکل تمام کانٹوں کے بستر پر پہلو بدلا۔ پھول ہاتھ سے ہٹا کر سرہانے کی طرف رکھ دیئے۔ گلے میں تلخی سی محسوس کی۔ ہاتھ بڑھایا تو ماں نے پانی دیا۔ بابو نے

دیکھا اس کے ایک طرف گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پنڈت جی کے کہنے پر بابو کی ماں نے اسے آہستہ سے اٹھایا اور ایک طرف لٹکتے ہوئے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ ترازو کے دوسرے پلڑے میں گندم اور دوسری اجناس ڈالنی شروع کیں۔ بابو نے اپنے آپ کو تنکا تنکا ہلتا دیکھا تو دل میں ایک خاص قسم کا روحانی سکون محسوس کیا۔ چاروں کے بعد آج اس نے پہلی مرتبہ کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی اور اتنا کہا:

"اماں..... کچھ گندم اور ماش کی دال دے دو سکھی کی ماں کو..... کب سے بیٹھی ہے بیچاری؟"

سادھو رام نے پھر اپنا ہاتھ بابو کے تپتے ہوئے ماتھے پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی چند بوندیں گر کر فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں میں جذب ہو گئیں۔ سادھو رام نے کپڑوں کو ایک طرف ہٹایا اور بولا:

"پنڈت جی..... وان سے بوجھ ٹل جائے گا؟..... میں تو گھر بار بیچ دوں..... پنڈت جی....."

بابو کی ماں نے سسکیاں لیتے ہوئے پنڈت جی کو کہا:

"مالکن..... کل نئی تال جاؤں گی؟..... کل..... نہیں تو پرسوں ملیں گے کپڑے..... لیے، مالکن! انہیں کپڑوں کی پڑی ہے۔"

بابو کو کچھ شک گذرا۔ اس نے پھر تکلیف سہہ کر پہلو بدلا اور بولا:

"اماں..... اماں..... آج میرا جنم دن ہے؟"

اب سادھو رام کے سر نے پھر ٹھوکر کھائی۔ ایک ہاتھ سے گلے کو دباتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

"ہاں بابو بیٹا..... آج جنم دن ہے تیرا..... بابو..... بیٹا!"

..... بابو نے اپنے جلتے ہوئے جسم اور روح پر سے تمام کپڑے اتار دیئے گویا ننگا ہو کر سکھی ہو گیا۔ اور منوں بوجھ محسوس کرتے ہوئے آنکھیں آہستہ آہستہ بند کر لیں!

دس منٹ بارش میں

..... ابوبکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے۔ یوں دکھائی دیتی ہے جیسے کوئی گشتاخ سارا راستہ کسی کوٹھے کی کان میں جا رہا ہے..... سخت بارش میں دو بنٹا کی باڑ سفر یا کا کلاب، خطیب سید حسین علی کے مزار شریف کے کھنڈر میں ایک لگتے ہوئے مٹکی رنگ کی گھوڑی جس کی پشت نم آلود ہو کر سیاہ ساٹن کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ سب بھیگ رہے ہیں ——— اور ماٹا بھیگ رہی ہے!

ماٹا کون ہے؟ اسے کچھ بخش کر لو یا کام دھین گئے۔ یا اس سے بہتر ماٹا۔ ماٹا ہے پھولا لال کی بیوی، ایک دس سالہ کاہل، جاہل، نااہل چھوکرے کی ماں۔ چند دن ہوئے شفیف کے موقع پر ہیوم پائپ کمپنی والوں نے پھولا لال کو کام سے الگ کر دیا۔ اس وقت سے اس کی پرسکون زندگی میں قسمت کے گرداب پیدا ہونے لگے۔ تلاش معاش

میں نہ جانے وہ کہاں چلی گیا۔ سنا ہے کہ وہ رانا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور جس شخص میں محبت کی سی کمزوری ہو وہ پاشا استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے..... مرحومہ رانی کا بیان ہے کہ پوہ کے ایک سرد نیلے سے دھندلکے میں اس نے پھرایا لال کو اپنی ہی برادری کی ایک عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ وہی عورت ـــــ کوڑی جو ابوبکر روڈ کے مکانوں میں سے گند اٹھایا کرتی تھی۔ ان دنوں پھرایا لال بے کار تھا۔ بے کار انسان کے عقل و فکر میں خون جگر پینے یا کثرت سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سماتا۔ بعض آدمیوں نے پھرایا کو کوٹ پتلی میں عینکیں بناتے ہوئے دیکھا ہے۔ قریب ہی کوڑی ایک غیر آدمی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی..... رانا پھر بھی پھرایا لال کو دل سے چاہتی ہے۔ یہ محبت اور جنون کے انداز ہیں کبھی چھٹتے ہیں؟..... اور رانا بھیک رہی ہے۔

رانا کی گھوڑی ابوبکر روڈ پر ہماری کوٹھی کے سامنے گھوم رہی ہے۔ وہ اس کا شب و بجور کا سارنگ!..... صرف اس کے ہنہنانے سے کبھی کبھی بجلی کے کوندنے سے اس کے ہونے کا علم ہوتا ہے۔ صبح سے بیچاری کو دانہ نہیں دیا گیا۔ نہ ہی اس کی جیسی والی ٹانگ پر ہلدی لگائی گئی ہے۔ بھوک کی شدت سے بے بس اور بگڑ کر وہ آوارہ ہو رہی ہے شاید پھرایا کو ڈھونڈتی ہوگی۔ پھرایا ـــــ جو اسے بھی چھوڑ کر کوڑی کے ساتھ چلا گیا ہے کوڑی جو کوٹ پتلی میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ ایک وقت میں ایک دل کے اندر مٹکی گھوڑی رہ سکتی ہے یا کوڑی۔ کوڑی یا رانا..... اور بھوکی مٹکی گھوڑی ہنہناتی ہے جیسے کبھی سکندر سے جدا ہونے پر بوسفس ہنہنایا تھا۔

ماٹا اپنے سر سے بوسیدہ کی اوڑھنی اٹھا کر پوچھتا ہے۔

"بابو جی ..... آپ نے یہاں رامی نہیں دیکھی؟ ..... رامی ..... میری مٹکی گھوڑی؟"

میں نے کہا "رامی؟ کون رامی؟ ..... اچھا رامی تمہاری مٹکی گھوڑی۔ ارے بودو ماٹا کی باڑ کے پیچھے تو کھڑی ہے۔ تمہیں رکھوالی نہیں دیتی کیا؟"

ماٹا آنکھوں کو سکیڑ کر باڑ کی طرف دیکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے جب کھلتے ہوئے مٹکی رنگ کی گھوڑی شام کے وقت بارش میں بھیگ جاتی تو وہ بھی شب دیجور کا ایک جزو بن جاتی ہے اور بے خود ہو کر جوت گنواتی آنکھوں کو اسے تاریکی شام یا شام تاریکی سے جدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ..... بارش کی رم جھم، سرس کی لمبی لمبی پتیوں کی کھڑکھڑ، گرتے ہوئے پتوں کے نوحے، رعد کی گرج، بجلی کی لپلپاہٹ، ٹیلوں کی ہیبت پر نالوں کے شور، اس کتیا کی اونہہ ..... اونہہ جس نے ابھی ابھی سات بچوں کا جھول جنا ہے۔ اور ایک بچے کو منہ میں پکڑے کسی سوکھی، نرم و گرم جگہ کی متلاشی ہے۔ ان سب کے شور و غوغا میں بھوری گھوڑی کی جگہ وہ ہنہناہٹ علیحدہ سنائی دیتی ہے۔

پاٹر کہتا ہے "میں بھیگ رہا ہوں ..... اور وہ بھی بھیگ رہی ہے"

ماں خفا ہوتے ہوئے کہتی ہے "گیلا ..... گیلا ..... گیلا ..... تو ہر بات کو گیلا کرنے والا ہو گیا ہے۔ ایں! یہ موئی کتیا تو وہیں بیٹھی ہے۔ میرا تو رگر جائے گا۔ یہ بے وقت کی باتیں رام رے ..... !"

نے نعش کا فراک کو صحن میں پڑا ہوا بوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی مری ہوئی خاتمہ ہو۔ ان تا دامن ہے کہ میں نے نعش کا فراک کیوں نہیں اٹھایا۔ حالانکہ ماٹا کی گھوڑی پکڑنے میں میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ ماں اس لئے بھی خفا ہے کہ میں پاٹر جیسا کاہل نہ

نوجوان کے ساتھ بارش میں لنگوٹا باندھ کر نہانے کے لئے چلا ہوں۔ ماں کا خیال ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ رہ کر آوارہ ہو جاؤں گا۔ حقیقت میں ماں کے ساتھ پریل اس لئے ہیں کہ میں نے راٹا کو مشکی گھوڑی پکڑنے میں مدد دی ہے۔ گھوڑی کو شام کی تاریکی سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کی ایال راٹا کے ہاتھ میں دے دی ہے اور اس فعل کے ارتکاب میں اس سے چھو گیا ہوں۔

میں نے کہا: "اسی پاپ شمنت میں تو میں نہا رہا ہوں، ماں!"

حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہوں۔ پاشا کا کیا وہ تو ہر قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہے..... کاش! پیرا باٹا کبھی نہ آئے اور راٹا کو ہر ایک کام کے لئے ہمارا مرہون منت ہونا پڑے۔ کیا وہ گھوڑی ہی پکڑ لائے گی اور کوئی کام نہیں کرے گی؟

ماں کہتی ہے "اوہار، بڑھئی، چمڑہ رنگنے والے ایک برہمن کو چھبیس قدم، جاروں بولنے والے اٹھائیس قدم، موٹا ماس کھانے والے چونسٹھ قدم پرے سے بھرشٹ کر سکتے ہیں۔ مگر میں ماں کو کہتا ہوں "ماں! ان لوگوں کی وجہ سے تو ہم زندہ ہیں۔ برہمن بھی کی یہ لوگ باڑ ہیں..... اور پھر تھوڑی بہت برائی اچھائی کو بچانے کے لئے دور اندیشی سے زندہ ہے ماں کہتی ہے۔ کلی جگ سے بیٹا گھور کلی جگ!

بظاہر ماں بشن سے اپنی کرتی ہے مگر دراصل اس کا مقصد سب کچھ مجھے سنانا ہوتا ہے۔ ستیا یگ، ترتا یگ، دواپر اور کلی جگ ایک دن ہے۔ کرت کریتا، دواپر اور کلی جگ کے ہیں۔ کلی جگ یا ۴ لاکھ بتیس ہزار برس کا ہے۔ پچھلے برس کرت کے بعد میں کلی جگ کو صرف پانچ ہزار چھبیس برس گذرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں ——— اور یہ بے وقت

کی بارشیں!"

"بارش نے کافی سردی پیدا کر دی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں بھائی..... میرے تو دانت بجنے لگے ہیں..... چلو برآمدہ میں چلیں۔"

"لیکن..... ابھی بہت وقت نہیں ہوا۔"

"چائے بنا دو نا ــــ سردی ہو رہی ہے۔"

"چائے بن جائے گی، سگریٹ نہیں ملیں گے۔"

"کوئی بات نہیں! پڑیاں ہیں میرے کوٹ کی جیب میں۔"

"ہمارے ٹی سٹڈ کیٹ کو آج کی بارش بہت فائدہ مند ہے۔"

"ہاں ــــ چائے کے پودوں کی ڈھلوان جنوب کی طرف ہے۔ ابلیکر روڈ کا تمام پانی ادھر نہیں جاتا۔ مگر زیادہ بوچھاڑ چائے کے پودوں کے لئے نقصان دہ ہے جڑیں گل جانے کا اندیشہ ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار کا تو کہنا ہی کیا..... کچھ بھی ہو یہ بارش ایسی ایشٹی سٹڈ کیٹ کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ ہماری آمدنی بڑھ جائے گی۔ کیوں ہے نا؟"

"ہاں!"

"ایشور اپنی دیا بارش کے ذریعہ بھیجتا ہے۔"

"ہاں ــــ دیا..... آمدنی ــــ ایشور اپنا کی جھونپڑی کی کھپریل اڑ رہی ہے۔"

"ایشور کی دیا....."

اب بارش بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔ گویا سب کی سب ابلیکر روڈ پر ہی برس پڑے گی۔ نکٹیسر کے پتے بلخ کے پودوں کی طرح بھیگتے نہیں، پانی کے قطرے ان پر پارے کی طرح

لٹکتے ہیں۔ کہیں کہیں اٹک کر ایک مدور پہرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور قطرہ وہاں ٹپکتا ہے تو پہرا زیادہ مدور اور بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر نازک نازک رات کی رانی کے پھول اس بوچھاڑ کی تاب نہیں لا سکتے ..... ایک بڑھیا کے دودھ کو کٹورا میں بسنے والے نکٹیسر کے پتوں کی طرح ہیں۔ بارش ان کی سطح کی چھتوں پر سے بہتی لڑھکتی ہوئی ابوبکر روڈ پر آ رہی ہے۔ بارش کے قطرے ان کے لئے مدور پہرے ہیں ..... مگر رات کی رانی ـــــ رانا سر پھینک دیتی ہے گلابی گلابی سرا نکال کر کھیرل کو باندھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے لچکدار پتوں کی وجہ سے گن ولیا کی حسین بیل دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بچاری مشکی گھوڑی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اب یہ اس کے لئے ایک نئی مصیبت ہے۔ جھونپڑی کی تمام چھت سے پانی بہنے لگا ہے۔ اور پہلے کی اوڑھنی تو محض برسی پناہ ہے اس کے تمام کپڑے بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئے ہیں۔ شام کے اندھیرے میں جب بجلی چمکتی ہے تو وہ عریاں سی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں ایشور کی دیا ہے کوئی نرم و گرم کپڑے سے جسم تن کرتا ہے تو کوئی عریاں ہو جاتا ہے کسی کی آمدنی دوگنی ہو جاتی ہے تو کسی کی کھیرل ٹوٹ جاتی ہے ..... کوئی شب بھر گذارتا ہے کوئی شب تنہا

دگنی ولیا کی بیل کو جب تند ہوا ہلاتی ہے تو یوں دکھائی دیتا ہے۔ گویا کوئی حسینہ بسنت دھونے کے بعد لب بام آ کے چمکیلے سیاہ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے چھانٹتی ہے رانا کا بے عقل کاہل ـــــ پاگل ڈکا جھونپڑی میں سویا پڑا ہے۔ بچے ہوئے کے پاس گرم ہو کر ـــــ اگر وہ جاگتا تو مشکی گھوڑی پکڑنے کے لئے اس کی ماں

کو بیمار ہونے مفت نہ ہونا پڑتا..... پھر ایا کال تو چلا ہی گیا ہے۔ کاش! وہ کاہل لڑکا ہمیشہ کی نیند سو جائے!

شاید راٹا کھپریل بندھوانے کے لئے ہمیں بلائے۔ اس کے بارش کی وجہ سے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے، بجلی کی چمک میں اس کا بدن کتنا خوبصورت اور سڈول دکھائی دیتا ہے لیکن ماں..... ماں کہتی ہے کل جگ ہے۔

..... کلکتہ کی مارکٹ میں چائے کتنی بکے گی؟ کتنی دساور کو جائے گی۔ میری آمدنی بڑھ جائے گی۔ پراشر کی بھی..... لیکن وہ کم بخت بیڑیاں پیئے گا۔ چائے کے پیالوں کے پیالے اور شراب اور.....

"مجھے نکلے گلٹی، بیٹے کے توڑے..... سوئے کا سیارہ جائے تو....." راٹا اپنے چھوکرے کو گالیاں دیتی ہے۔

راٹا کو چائے کی ضرورت نہیں، گالیاں دیتے ہوئے اس کے جسم میں کافی گرمی آگئی ہے۔ وہ نکما، سست لڑکا، اس کے ساتھ کھپریل بھی تو نہیں بندھواتا۔ آرام سے بجھتے ہوئے چولھے کے پاس پڑا رہتا ہے۔ پانی کی چھینٹیں پڑتی ہیں تو ٹانگیں سکیڑ لیتا ہے جب اندر پانی ہی پانی ہو جائے گا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھے گا۔ صرف یہ کہے گا۔ ماں کیا بات ہے جو اتنا شور مچا رکھا ہے؟ چین سے سونے بھی نہیں دیتی..... جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تو شاید یہ بھی کہے گا۔ میں ایسی عورت کے گھر کیوں پیدا ہوا جو ایسی ایسی گالیاں دیتی ہے۔ جسے میری کوئی ضرورت نہیں۔ کہتی ہے سوئے کا سیارہ جائے۔ تو..... وہ بیوقوف کیا جانے کہ جب ماں یہ کہتی ہے کہ تو سوئے کا سیارہ جائے تو اس وقت وہ اسے ہمیشہ کی نیند سلانے کے لئے طوفان باد و باراں میں تن تنہا بے یار و مددگار اپنی جان تک لڑا دیتی ہے۔

ابھی انتہائی گرسنگی کی وجہ سے اس کی مشکی گھوڑی ہنہنا رہی تھی۔ جیسے سکندر سے جدا ہونے پر بوس فلیس ہنہناتا تھا۔ مگر اب وہ خاموش ہے۔ شاید اس نے راٹا کی بے بسی کو دیکھ لیا ہے۔ اور پھر ایا کے چار کو ـــــ اب وہ کبھی نہیں ہنہنائے گی۔

پاشر بولا" وہ ایک مرتبہ مدد کے لئے اشارہ تو کر دے ؟

"ہاں ـــــ اور ہم دونوں ..... " میں نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم خود ہی چلے جائیں ؟"

"منگماں کہتی ہے۔ کل جگ تو صرف پانچ ہزار برس گذرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں؟ پھر وہی گالیاں ....

"تجھے اوے ڈھائی گھڑی کی ..... نکلے تیرا جنازہ للپاتارا ..... گور میں پڑے ..... خون تھوکے تو ....."

شاید وہ چھوکرا سر چنا ہوگا۔ میں کیوں اس عورت کے گھر پیدا ہو گیا جو مجھے گور میں بھیجنا چاہتی ہے۔ وہ یہ تو نہ کیا جانے کہ حقیقت میں وہ اسے اپنی گور سے بچانے کے لئے اپنی جان تک لڑا رہی ہے۔ وہ دس سالہ بے عمل، غافل، کاہل چھوکرا اب تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صرف اس لئے کہ راٹا کو اس سے محبت ہے۔ جس کا اس جوانا مرگ کو اچھی طرح سے احساس ہے۔ وہی راٹا کی زندگی کا سہارا ہے۔ وہی اس کی آنکھوں کا نور ہے۔ اسی لئے تو وہ بے کس اور اندھی ہے ..... اگر راٹا پھر ایا لال سے محبت نہ کرتی۔ اگر وہ اس چھوکرے پر اپنی تمام امیدیں نہ لگا دیتی تو سکھی ہو جاتی۔

ایک کچا روڈ منحرک ہو کر کوٹلے کی کان میں جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ بہاؤ کے خلاف ایک دھقان بھیگتا ہوا آہستہ آہستہ اسی جانب آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیل کی رسی ہے۔

شاید وہ بیل کو کہیں سے چرا لایا ہے۔ غالباً اس کی خواہش ہے کہ ہم اسے برآمدے میں کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے جگہ دیں، اور یہ ممکن نہیں کہ ان جانے بیل گوبر سے برآمدے کا فرش خراب کر دے۔ اور ہاں..... پھر چوری کے مال کو اپنے پاس رکھنا.....

"بابو جی سلام" دہقان بولا

"سلام!" پراشر نے زیر لب کہا۔

پھر وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک گیلا کاغذ پراشر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے ـــــ پروانہ راہداری..... یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بیل چوری کا مال نہیں اپنا ہے اچھے دوتال مل کی منڈی میں بیچنے کے لئے جا رہا ہے۔

باعث تحریر آنکہ

ایک راس گاؤ نر، جس کے سینگ اندر کو مڑے ہوئے ہیں، رُم کے سیاہ بالوں میں سفید.....

ـــــ اور باقی کا بارش نے دھو دیا ہے۔ کتنے بے ربط ہوتے ہیں یہ دہقان لوگ۔ پہلے سینگ اور پھر دُم ـــــ ان کے لئے گویا دُم اور سینگوں کے درمیان کوئی جگہ ہی نہیں۔ جسم کا رنگ پہلے آنا چاہئے تھا۔ جسم جو بارش میں گیلا ہو کر سفید ساٹن کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اندھیرے میں اس کا سفید رنگ نظر آتا ہے۔ مگر جب بجلی چمکتی ہے تو نیلی بجلی کا ایک جزو بن جاتا ہے..... بیل تمام زور لگا کر ڈکراتا ہے۔ جیسے شری مہاراج کو دیکھ کر پیار سے ان کا نندی گن ڈنک رہا ہو۔ بیل صبح سے بھوکا ہے۔ مگر اپنے بوڑھے، کمزور نکمے مالک کو پیار کئے جاتا ہے۔ اگرچہ عقل حیوانی سے جانتا ہے کہ بوڑھا کل اسے تال مل کی منڈی میں بیچ ڈالے گا۔ ہائے! یہ محبت اور جنون کے انداز بھی کبھی چھٹتے ہیں؟

"کیوں بیچتے ہو اتنے خوبصورت بیل کو؟"

"بابو جی فصلیں تباہ ہو گئی ہیں..... اور مالیہ دینا ہے..... اُف! یہ بے وقت کی بارشیں۔ کیا میں اندر آ جاؤں، اس چھت کے نیچے؟"

"او نہیں ـــــ تمہارا یہ بیل گوبر سے برآمدے کو خراب کر دے گا!"

"میں صاف کر دوں گا بابو جی! ـــــ شیشے کی طرح..... بیل نیچے سے بھوکا ہے۔ اتنی سردی کہاں برداشت کرے گا۔ اور پھر دوسری بات نہیں، فقط یہ پرواز راہداری میں چل گیا، تو یہ بیل چوری کا مال سمجھا جائے گا۔ تال محل کا تھانے دار جہان خان بڑا کڑوا آدمی ہے۔ مار مار کر آدھ موا کر دے گا۔ بیل جاتا رہے گا۔ تال محل میں اس بیل کی قیمت پر ہی تمام امیدیں لگا رکھی ہیں..... ہائے یہ بے وقت کی بارشیں....."

"جاؤ۔" پراشر نے کہا..... "ہم تمہیں یہاں جگہ نہیں دے سکتے..... جاؤ....."

دہقان سہم کر چلا گیا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا۔ گویا رات کو ہمارے ہاں ہی سیندھ لگائے گا۔ "اگر وہ سیندھ لگائے بھی تو حق بجانب ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

بیل ابھی کہ روڈ کے چوک میں گر پڑا ہے، وہ دہقان کے اٹھائے..... کسی کے اٹھائے نہ اٹھے گا۔ وہ ندی گن کی طرح دہقان کو دیکھ کر کبھی ہانک نہیں لگائے گا۔

پھر میں نے پراشر سے کہا۔ "چائے تیار ہے بھائی ـــــ کتنی پیالیاں پیو گے؟"

"چھ!"

"پارہ شر..... اور ورجن بیڑیاں؟ کہہ دو ہاں۔"

"زیادہ!"

"چھی۔"

—— بارش اور بھی تیز ہو رہی ہے اور..... اور راٹا کی گالیوں کی بارش بھی!

راٹا کی کھپریل گر چکی ہے۔ دیواروں میں شگاف ہو گئے ہیں۔ قریب ہی ایک سیٹھ کے سہ منزلہ مکان کا پرنالہ راٹا کی جھونپڑی پر گرنے لگا ہے۔ جھونپڑی کے ارد گرد ابوبکر روڈ پر چلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر طوفانِ نوح کا خیال آتا ہے۔ کیا ہم راٹا کی مدد کر سکتے ہیں؟ باوجود کل جگ کے..... ہمارے برآمدے کے سوا اور کوئی نزدیک پناہ بھی تو نہیں ہے۔ پراشر خوش ہے۔ اس کے پاس چائے ہے۔ بیڑیاں ہیں..... اور بے پناہ راٹا ادھر آ ہی جائے گی۔"

راٹا چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پراشر کہتا ہے:

"ابھی وہ کہے گی۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لو، بابو جی۔"

"کبھی نہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے؟"

"یہ بارش کا دامن کیا اس کے لئے کم ہے؟ راٹا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں۔ جب کسی ایسے انسان پر عزت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں..... تو خود بخود ایک بہت بڑا دامن اس کے لئے کھل جاتا ہے.....؟"

—— اور راٹا کی تو مٹھیاں بند ہیں۔ کبھی کبھی وہ دانت پیستے ہوئے چیختی ہے۔

"جوان مرے..... کلموئے..... میں نے تو رو لیا تجھے بے چین!"

حیاتین "ب"

ایجرٹن روڈ کے عین وسط میں جہاں جلی حروف میں "روڈ اپ" لکھا ہوا تھا اور نصف درجن کے قریب سُرخ لپھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے میں بطور ایک چھوٹے سوپرنٹنڈنٹ کے مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بہت لمبا ٹیپ تھا۔ جس سے بار بار مجھے مرمت طلب سڑک اور کٹی ہوئی روڈ کی پیمائش کرنی پڑتی تھی۔

"روڈ اپ" بورڈ کے پاس ہی کولتار کے چند خالی پیپے پڑے تھے اور ان میں سُرخ شیشوں والی بتیاں رات کے وقت استعمال کے لئے اقلیدسی نصف دائرہ میں پڑی تھیں۔ قریب ہی پگڈنڈی میں چند گہرے سے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ ان گڑھوں کو بطور چولہے کے استعمال کرتے ہوئے سڑک کے مرمت شدہ حصّے پر بچھانے کے لئے کولتار گرم کیا جا

رہا تھا۔ اور دور ایک چیتا چلاتا ہوا انجن بچھی ہوئی ٹکریوں کو جا رہا تھا۔

پھریروں اور خالی ٹینوں کے ساتھ ہی چند ساڑھی اور پوربی عورتیں سڑک کے مرمت طلب قطعہ زمین کو بڑے بڑے برشوں سے صاف کر رہی تھیں اور اپنے مخصوص ترنم سے گا کر کام میں روح پھونک رہی تھیں۔ پاس ہی سول لائن کے تھانے اور ایک بڑی سی زمین کے درمیان ایک اسوڑے کے نیچے دو ایک بچے بلک رہے تھے۔ زمین میں ایک جھونکے سے غلیلیں اور گوپھیے اٹھ میں لئے ثمر آور پودوں سے طوطوں وغیرہ کو اڑا رہے تھے۔ کنکری چھوڑتے وقت وہ بلند آواز سے "اللہ اکبر" پکارتے کبھی کبھی بے ہوئے چیخ زور زور سے ہنستے اور اپنی آواز کی گونج سے حظ اٹھاتے۔ میری توجہ زمین کی طرف لہسٹے کے نیچے بلکتے ہوئے بچوں کی طرف منعطف ہو گئی۔ بچوں کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ان کی چھاتیاں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ جب کوئی مارواڑی یا پوربی عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لئے اٹھتی تو ٹھیکیدار عرفانی خشم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ مگر جیسے ہی پس پشت گرگراتا ہوا انجن سیٹی دیتا، عرفانی اچھل کر انجن کی زد سے باہر پٹڑی پر کھڑا ہو جاتا۔

اس دفعہ ٹھیکیدار عرفانی نے ٹنڈر بہت کم رقم کا بھرا تھا۔ اس لئے مزدوروں پر سخت نگرانی تھی۔ سستا رگڑ گڑی کے کش لگاتا، دن میں دو دفعہ سے زیادہ پیشاب کے لئے کام کو چھوڑنا قاعدے کے خلاف تھا۔ بچوں کو ایک دفعہ سے زیادہ دودھ پلانے کی اجازت نہ تھی۔ مادیت سے پھلنے پھولنے یا پیدائش کی شرح کا کسی کو خیال نہ تھا۔ اور نہ حکومت کی طرف سے کوئی آسائش مہیا تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بلکتے ہوئے بچے بھوک سے نڈھال ہو کر مر جائیں گے۔

جمعدار رام اوتار کی مدد سے میں پگڈنڈی پر پڑی ہوئی روڑی کو ناپنے لگا۔ روڑی ساڑھے تین فٹ چوڑی آٹھ فٹ لمبی اور ایک فٹ گہری تھی۔ اور میرے اندازے کے مطابق ایک بڑے سے سیفوی گڑھے کے لئے کافی تھی۔ اس وقت میں نے ماتا دین کو اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر سستانے کی خاطر بیٹھتے دیکھا۔ ماتا دین ایک ادھیڑ عمر کا پوربی مزدور تھا۔ ذات اس کی کرمی تھی۔ جسم کے لحاظ سے وہ باقی مزدوروں سے کہیں اچھا تھا۔ دھوپ میں ماتا دین کا پسینے سے شرابور سیاہ رنگت کا عریاں تنومند جسم ایک بڑے کانسی کے مجسمے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

ماتا دین کو اس حالت میں دیکھ کر میں نے ٹیپ کر جمعدار رام اوتار کے حوالے کیا اور "روڈ اپ" کو پھلانگ کر ماتا دین کے پاس جا پہنچا اور بلند آواز سے چیخا:

"ہے..... ماتا دین!"

ماتا دین گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی خماری آلود نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے بولا: "مالک!"

"ہاں! مالک..... آرام کر رہے تھے نا؟..... شاید تم عرفانی کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے؟"

"رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ اس لئے ذرا....."

"یہ کوئی وجہ نہیں۔"

ماتا دین ایک مہیب انداز سے مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بدشکل چہرے میں مسوڑھے پھول کر بڑے بڑے گھناؤنے دانتوں کو گویا چھوڑ رہے تھے۔ وہ روڑی کرتے ہوئے بولا:

"کام چور نہیں ہوں مالک..... آپ جانتے ہیں میں تو دو ٹکیوں میں کام کے جاتا

ہوں مگر.....؟"

ماتا دین ایک ایماندار مزدور تھا۔ وہ باقی مزدوروں سے زیادہ ذہین تھا۔ اسے صوبارہ بات بھانے کی مزوت کبھی نہیں پیش آئی تھی۔ صبح جب اسی سڑک پر سورج کی پہلی ٹکیہ مشرق کی طرف نرسری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوتی اس وقت سے لے کر شام تک جب کہ دوسری ٹکیہ مغرب کی طرف شہر کے مکانوں کے بے ربط منڈیروں کی طلائی مغزی اوجھڑتے ہوئے ڈوب جاتی، وہ دو ٹکیوں میں برابر کام کئے جاتا۔ اسی اثنا میں گرد و غبار سے سینہ صاف کرنے کے لئے ماتا دین کوئی ابھر چناوری گڑگھاتا۔ اور چھپ کر ایک آدھ گڑگڑی کا کش لگاتا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے دم لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

عرفانی نظر سے اوجھل کھڑا تھا۔ اپنی زمرداری کا احساس دلانے کے بعد میں نے ماتا دین سے پوچھا:

"عرصہ سے من بھری ان عورتوں میں دکھائی نہیں دیتی..... اچھی تو ہے نا؟"

"اجی کہاں اچھی ہے۔" ماتا دین بولا "اسی کے لئے تو رات کو جاگنا پڑتا ہے اور دن کو بیری یہ دُشا ہوتی ہے۔"

مجھے ایک خدوش سے قطعۂ زمین کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سڑک کے ایک دم مغرب کی طرف مڑ جانے کی وجہ سے انجن کے پہیے پہنچنے سے قاصر تھے۔ مگر میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے ماتا دین بولا:

"مالک..... اسے بیری بیری ہو گئی ہے شاید مجھے یہ نوکری چھوڑنی پڑے۔"

"بیری بیری؟" میں نے اپنے شانوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "میں نہیں جانتا

بیری بیری کیا ہوتی ہے؟"

ماتا دین بولا۔ "آپ بیری بیری بھی نہیں جانتے..... آپ سے پڑھے لکھے آدمی نہ جانیں گے تو اور کون جانے گا؟"

——اور ایک مستعار سی مسکراہٹ ماتا دین کے چہرے پر لڑھکنے لگی۔ اس نے اپنی لپٹی ہوئی دھوتی کے ایک پلّے کو کمر سے نکالا اور کپڑے کی کئی تہوں میں سے کاغذ کے ایک خستہ ٹکڑے کو برآمد کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لال مرچ بھاوتی مرچ خیراتی ہسپتال کی تشخیصی پرچی تھی۔ مرض کا نام بیری بیری لکھا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پٹھوں میں ورم ہو جانے کو بیری بیری کہتے ہیں، اور یہ مرض خوراک میں حیاتین 'ب' کے کافی مقدار میں موجود نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

"ترکا من بھری کے پٹھوں میں ورم ہو چکے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ماتا دین نے انگوٹھے اور انگلی سے ایک بڑے سے سوراخ کی شکل پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اتنے بڑے..... سرکار۔"

میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

ماتا دین کہنے لگا۔ "اسے کھوراک اچھی نہیں ملتی..... ٹراک فو کی ریٹ دیکھی ہے نا آپ نے؟ اس نے گول مانس، انڈے، مکھن اور پنیر کھلانے کے لئے کہا ہے۔"

اس وقت میں سوچنے لگا۔ بھلا ترکھی سوکھی دال چپاتی میں سے من بھری کیونکر حیاتین 'ب' اخذ کر سکتی ہے۔ اگرچہ کورنی، کرمی اور نیچ ذات کے پوربی لوگ گوشت کھا لیتے ہیں۔ مگر ماتا دین پٹھوں کا نرم نرم گوشت، انڈے، مکھن، پنیر، ٹماٹر اور اس قسم کی امیرانہ خوراک کہاں سے مہیا کرے گا۔ جہاں تک میرا خیال تھا، اس نے تو سرے سے سبزی بھی استعمال

نہ کی تھی اور اپنے گاؤں کے کسی بھائی بند کے ہاتھ مسوری والی منگوا رکھی تھی جسے وہ صبح و شام کھاتا تھا۔ یہی تو اسے دانتوں کی سکروی (SCURVY) تھی۔ سکروی خوراک میں وٹامین 'سی' کے مفقود ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس کے مسوڑھے بہت زیادہ پھول کر ٹیڑھے میڑھے دانتوں کو چھوڑ رہے تھے۔ میں نے کہا میرخواہ کسی ماتادین یا گنگادین کی بورون من بھری سے زیادہ خوبصورت ہو اور کوئی اس کے لئے ماتادین سے زیادہ جفاکشی کرے مکھن و پنیر کی سی خوراک مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں اس ڈاکٹر کی حماقت پر ہنسنے لگا، جس نے بیری بیری کا نام ماتادین کے ذہن نشین کرا دیا تھا اور اس قسم کی خوراک بطور علاج لکھ دی تھی۔ ماتادین کے بیان کے حسابق ڈاکٹر کا اپنا رنگ 'سنگرہی' (شنگرفی) ہو رہا تھا۔ کوئی جانے کھون پھٹ کر باہر آ جائے گا۔ ڈاکٹر نے ماتادین کو وہ دوائی کی بوتل بھی دکھائی تھی جس میں جمائین اب کا جوہر کافی مقدار میں موجود تھا۔

یکایک مجھے یاد آیا۔ ماتادین کام چھوڑنے کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا،

"تم یہاں سے کام چھوڑ دو گے..... کہاں جاؤ گے ماتادین؟"

"چھاؤنی میں مالک!..... وہاں ڈنڈی دار کے پاس ملا جم ہو باؤں گا۔ ڈنڈی دار تمہاری طرح مہربان ہے۔"

پھر ماتادین نے بتایا کہ ایجرٹن روڈ اور ایبٹ روڈ کی مرمت سے پہلے جبکہ لاٹ صاحب کا دفتر رہا تھا وہاں ماتادین اور من بھری کام کر رہے تھے۔ ڈنڈی دار ادھر آ نکلا۔ دھوپ میں بیٹھی ہوئی من بھری کو دیکھ کر ماتادین سے بولا "اس بچاری کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ میرے ساتھ چھاؤنی چلو، سٹور میں بہت سے قلی چاہئیں تمہیں رکھ لیں گے، پیسے اچھے مل جائیں گے۔"

پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا:

"اس نے کھوراک دینے کا بھی وعدہ کیا مالک ..... اسٹور میں کام کرنے والے ڈنڈی مار آٹھ پکا کر وہاں سے بہت کچھ اڑا سکتے ہیں۔ میس (MESS) میں سے بچا انڈے وغیرہ بھی لے سکتے ہیں۔ کم از کم راشن میں سے تو کچھ نہ کچھ ان کے بچے پڑ ہی جاتا ہے"

میں نے سوچا، شاید تاتا دین کو وہاں سے چائے، چینی بھی مل سکیں اور اس کی سکڑی بھی دور ہو جائے۔ میس میں کار، گوشت، کرم کلا، شلجم، رلم ترئی سبھی کچھ تو آتا ہے۔

ایک محنتی مزدور کو کھورے پر ضرور رنگ ہوتا ہے۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ تاتا دین کو کسی صورت بھی اس کے ارادہ سے باز رکھوں، کون جانے من بھری کی بیری بیری کا علاج ہو جائے اور پھر وہ بھی ٹنگھ بھی ہو جائے۔

چند دنوں بعد میں عرفانی کا معتبر ملازم ہو گیا۔

ایک پرانے قبرستان میں ہمارے بزرگوں کی ہڈیوں اور ایک مسماری گرجھی کے کھنڈروں میں سے ایک سرکاری عمارت آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگی۔ میرے ہاتھ میں وہی پرانا ٹیپ تھا بسا اوقات مجھے بنیادوں کے اندر گھس کر کھدائی کی پیمائش کرنی ہوتی اور کبھی کندہ کاروں اور سنگتراشوں کے کام کا جائزہ لینا ہوتا۔

عرفانی نے تمام بچوں والی عورتوں کو کام سے علیحدہ کر دیا تھا۔ جو عورتیں ملازم رکھی گئی تھیں وہ پیسے کم لے کر مردوں کے برابر کام کرتی تھیں۔

جب سرکاری تعمیر کی چھت پر لنٹل ڈالنا پڑا تو چند ایک مزید مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوئی۔ یہ کام عرفانی نے میرے سپرد کیا۔ مجھے چند محنتی اور ایماندار مزدوروں کی ضرورت تھی۔ میں نے جمعدار رام اوتار سے تاتا دین کا پتہ پوچھا کہ اسے جمعدار نے مشکوک نگاہوں بانگاہ

سے میری طرف دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے ماتا دین کا پتہ بتا دیا اور میں اس کی تلاش میں چھاؤنی جا پہنچا۔

شام کا وقت تھا۔ صدر بازار کی بجلیاں ابھی روشن نہ ہوئی تھیں۔ ایک گھر اور مرال مزدوروں کی گنجان بستی لال کرتی اور فالو رلائٹر پر چھایا ہوا تھا۔ اور وقت سے پہلے تیرگی پیدا کر رہا تھا۔ بڑی دقت کے بعد مجھے ماتا دین کی جھونپڑی ملی۔ ایک بیٹھے ہوئے چھپر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا اور جھونپڑی میں ماتا دین گڑگڑی سلگا تمباکو پی رہا تھا۔ ایک خاص قسم کی بو سب طرف پھیلی ہوئی تھی، ماتا دین کے قریب ایک رکابی میں کوڑی بھر مکھن پڑا تھا۔ ایلومینیم کی ایک تھالی میں ایک بڑا سا گولبی کا پھول رکھا تھا اور پھول میں سے ایک سنڈی کچھ چپ چپا، لسلسا سا لعاب اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی تھالی کے کنارے کنارے رینگ رہی تھی۔

جاتین ہی سے تھی ایک مسکراہٹ ماتا دین کے ٹیڑھے بیڑھے دانتوں اور چھوٹے ہوئے مسوڑھوں کو دکھانے لگی۔ عین اس وقت جھونپڑی کے اندر سے کراہنے کی آواز آئی۔

میں نے جھونپڑی کے اندر ایک تاریک سے کمرے میں جھانکا، اس کمرے میں من بھری پڑی تھی۔ وہاں ہوا اور روشنی کی پہنچ نہ تھی۔ میں نے کہا، مہربان ڈنڈی دار کی مہربانی سے من بھری کو خوراک تو اچھی مل جاتی ہے ممکن ہے اسے میری بیری سے نجات حاصل ہو جائے تو بھی اس قسم کی فضا میں ضرور وہ کسی اور خوفناک بیماری کا شکار ہو جائے گی۔ دنیا میں خوراک ہی سب کچھ نہیں، روشنی بھی تو ہے کھلی ہوا ہے ..... اور دل ہے!

یک لخت روشنی سے اندھیرے میں چلے جانے پر مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ من بھری کا سہما ہوا چہرہ اور مسلوب جسم نظر آنے لگا۔ اپنے کتابی اور سنگ یشب کی طرح

نعد چہرے کے ساتھ من بھری ہو بہو اس مصری لاش کی مانند دکھائی دیتی جس پر ابھی ابھی حنوطی عمل کیا گیا ہو اور جسے نسلوں تک محفوظ رکھنے بنانے کے لئے ممی میں اتارا جانا ہو۔

ماتا دین نے گڑگڑی کا ایک لمبا کش لگایا، اور برتن میں سے سنڈی نکال کر باہر پھینک دی۔ گوبھی کو چیرا، اور مصالحہ بھونتے ہوئے اسے تسلے میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جورو کے بیمار ہونے کی وجہ سے ڈنڈی مار اسے بہت کم کام دیتا ہے۔ تمام قلی افسروں کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مگر اسے افسروں کے نزدیک جانے کا کام ہی نہیں دیا جاتا۔ اسٹور کیپر ڈنڈی مار کا سگا ماموں ہے، راشن میں سے سب کچھ مل جاتا ہے۔ آخر ڈنڈی مار کتنا اچھا آدمی ہے، ایسے چند آدمیوں کے سہارے ہی تو دنیا جیتی ہے۔

پھر میرے قریب آتے ہوئے ماتا دین بولا: "ایک کنجوسی کی کھبر سناؤں مالک؟" ——

اور پھر میرے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے بولا: "وہ امید سے ہے۔"

ماتا دین کے بیان کے مطابق ساڑھے تیرہ برس بیاہ کو آئے تھے اور اس وقت تک اولاد کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میری دانست میں تو یہ ماتا دین کی خوش قسمتی تھی۔ غریب طبقہ کے لوگ عموماً کثرتِ اولاد سے نالاں ہوتے ہیں، ان کے لئے تو ایک بچہ بھی بوجھ ہو سکتا ہے۔ مگر ماتا دین خوش تھا۔ میں نے سوچا شاید من بھری پہلے سے بھی زیادہ بیمار ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی کچھ بیماریاں قدرتی طور پر دور ہو جائیں۔ بہرصورت من بھری کے عرصہ تک بیمار رہنے یا زچگی میں ماتا دین کو اکیلے ہی گھر کا جوا اٹھانا پڑے گا۔ علاوہ اس کے خرچ بھی دوگنا ہو جائے گا۔

ماتا دین کی اس عجیب و غریب زندگی میں کھو کر میں اپنے کام کو بھی بھول گیا۔ میں نے کہا ڈنڈی مار کی مہربانی سے ان لوگوں کو جیاتین 'ب' اور 'ج' دونوں مل جاتے ہیں۔

ان کی خوشی ـــــ بچے کی امید بھی شاید جیا نین ب، کا کرشمہ ہے اور بچے کو بھی اس کے مقدر کا سب کچھ مل جائے گا۔ اب وہ عرفانی کی مزدوری نہیں کرے گا۔ اسے پروا ہی کیا ہے میں نے اس کے سامنے مزدوری کا تذکرہ ہی نہ کیا۔ گویا میں اسے یونہی دیکھنے آیا تھا۔

عرفانی کا مال و اسباب شہر میں لے جانے کے لئے چھکڑوں میں سے دو ایک بیل زخمی تھے، پھر بھی ان سے جابر کام لیا جا رہا تھا۔ انجمن تحفظِ جانوران کے ایک افسر نے گاڑی بانوں کا چالان کر دیا۔ اس قضیہ کو نمٹانے کا کام بھی میرے سپرد کیا گیا اور میں انجمن کے ایک افسر کو رشوت دینے میں مصروف تھا۔

ایک طرف سے ماتا دین ہانپتا ہوا آ نکلا، وہ بمشکل پہچانا جاتا تھا۔ اس چند ماہ کے عرصہ میں اس کی شکل یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے دانت زیادہ گھناؤنے ہو گئے تھے اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے وہ بار بار آنکھیں جھپکاتا تھا۔ پہلے تو وہ چند لمحات مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر میری آواز کو پہچان کر بولا:

"مالک!..... رام اوتار کے کہنے پر یہاں آیا ہوں۔ وہ کہتا تھا۔ آپ کو مجوری چاہئے۔ میرا چھوٹا بھائی آپ کے پاس کام کر ہی رہا ہے، مجھے بھی رکھ لو۔"

میں اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا۔ بھلا دو ٹکیوں میں کام کئے جانے والے ماتا دین کو کون مزدور نہ رکھے گا۔ لیکن میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"کیا ڈنڈی دار کا راشن ختم ہو گیا ہے؟"

ماتا دین کچھ نہ بولا۔

"کیا تمہیں خوراک نہیں ملتی اب؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

ماما دین آنکھیں جھپکتا ہوا انجمن تحفظ جانوراں کے افسر کی طرف دیکھنے لگا، وہ افسر جان گیا کہ یہ ضرور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی موجودگی نہیں چاہتا۔ وہ خود بخود وہاں سے ہٹ گیا اور ایک کچی دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ ماما دین بولا:

"کیا کہوں مالک!..... ڈنڈی مار نے تو ہماری چونگی برباد کر دی ـــ کسی کی شکل سے کوئی کیا جانے۔ بڑا بدماس تھا جب مجھے کام کرتے ہوئے چند دن ہو گئے تو کہنے لگا فلیرا نے اسٹور کیپر کو شکایت کر دی ہے، پھر بھی میں تمہیں تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں سب کچھ گھر پہنچا دیا کروں گا۔ دو تین دفعہ گھر پہنچا تو وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود تھا۔"

"علاوہ من بھری کہاں تھی؟" میں نے دم روکتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اندر تھی..... سیدھی سادھی عورت..... بھانسے میں آ گئی۔ سرکار ہم تو تنخواہ والے آدمی ہیں۔ جب میں نے کھری کھری سنائیں تو ڈنڈی مار نے گھر آنا دینا بند کر دیا اور دوسروں سے سنا کام لینے لگا۔ اپسر جھڑکنے لگے۔ تلی تنگ کرنے لگے۔ میں نے اس کی نوکری چھوڑ دی اور گھر آ کر میں کام کرنے لگا۔"

پھر ماما دین نے اپنا شانہ برہنہ کیا۔ اس پر ایک بڑے سے زخم میں چربی دکھائی دے رہی تھی۔ ماما دین نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ بعد میں بس کی لوریاں اٹھانے سے ہوا..... میری جان ہی تو نکل جاتی، اگر میں وہاں سے ملازمت نہ چھوڑتا..... میں نے جھوٹ بھی سہی مالک..... لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔"

انجمن تحفظ جانوراں کا انسپکٹر قریب آ چکا تھا۔ میں نے ماما دین کا ایک روپیہ اس کی مٹھی میں دیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ تمام کام ٹھیک ٹھاک کر دینے کا وعدہ دیا۔ اس وقت مجھے من بھری کے ہونے والے بچے اور اس کے مستقبل کے سوا اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ماما دین کا شکریہ

شاید اب بھی میرے سامنے تھا۔ میں نے انجمن تحفظ جانوراں کے انسپکٹر کو ماتا دین کا نشان دکھاتے ہوئے پوچھا "کیا آپ کا محکمہ ایسے ظلم کا انسداد نہیں کرتا؟" انسپکٹر صاحب نے جیب میں پائپ کا کانوٹ ٹھونستے اور اپنے پالش کئے ہوئے بوٹوں پر چھڑی مارتے ہوئے کہا "چودھری صاحب قبلہ..... وہ تو صرف جانوروں کے لئے ہے؟" ـــــ اور میں نے ماتا دین کو مزدور دکھ لیا۔

سڑکوں اور عمارتوں کے چیف انجینئر نے عرفانی کی بنائی ہوئی ایجرٹن روڈ کا نقص قرار دے دیا۔ چیف انجینئر کے ساتھ رشوت نہ چل سکی اور ایک دفعہ پھر ایجرٹن روڈ پر روڈ اپ کے بورڈ کھڑے ہو گئے۔

پھر نہر میں چند ایک چھوکرے سڑک پر سے کنکر اٹھا اٹھا کر انہیں ہوا میں پھینکتے ہوئے دکھائی دینے لگے، وہ گوپیئے کو چھوڑتے ہوئے اونچی آواز سے اللہ اکبر پکارتے سنائی دیتے تھے ـــــ ماتا دین کا چھوٹا بھائی مینسر کام کرنے کے بعد دو ایک کو لتار کے خالی ٹینوں کے پیچھے پڑ کر ستانے لگا۔ "روڈ اپ" کو پھلانگتے ہوئے میں اس کے پاس پہنچا میں نے چلاتے ہوئے کہا "ہے..... مینسر!"

مینسر گھبرا کر بولا "مالک!"

"ہاں..... مالک!" میں نے کہا "ستا رہے تھے نا؟ اور ماتا دین کہاں ہے؟ اس کی چاروں سے غیر حاضری لگ رہی ہے؟"

مینسر نے دبی آواز سے کہا..... "ماتا دین حوالات میں ہے سرکار!"

ـــــ میں اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا "حوالات میں؟"

مینیسر نے بتایا کہ ماتا دین نے ایک ڈاکٹر کے ہاں چوری کی، اور بھاگ کر ایک سفید دوائی پلائی۔ بعد میں پکڑا گیا۔ پولیس آئی تو وہ گھر میں ملا، بھاگ اس میں سے آدھی دوائی کھا چکی تھی ـــــ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں نے گھوم کر کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھا۔ مجھے وہ سب کی سب بیمار دکھائی دینے لگیں، گویا انہیں بڑے بڑے ورم ہو رہے ہوں۔ میرے تصور میں من بھری کا سنگ یشب کی طرح زرد چہرہ ظاہر ہو گیا۔ مجھے ماتا دین سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں حوالات میں گیا تو دیکھا کہ ماتا دین مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ مستعارنہ تھی۔ اسے اپنی قید کی ذرا بھر بھی پروا نہ تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کے ورم درست ہو جائیں گے۔ وہ خوش تھا کہ مینیسر کے ہاں وہ آرام سے رہ کر ایک تندرست بچہ کو جنم دے گی ـــــ مگر ماتا دین کیا جانے کہ شدت غم سے من بھری کا حمل گر چکا ہے۔ وہ مینیسر کے بازوؤں میں زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے، اور خون سے مینیسر کی جھونپڑی کی تمام زمین سنگین ہو رہی ہے!

لچھمن

لچھمن نے کنوئیں میں سے پانی کی ستر ہویں گاگر نکالی۔ اس دفعہ پانی سے بھری ہوئی گاگر کو اٹھاتے ہوئے اس کے دانتوں سے بے نیاز جبڑے آپس میں جم گئے۔ جسم پر پسینہ چھوٹ گیا۔ اس نے داہنے ہاتھ سے نندو کی بہو ـــــ گوری کی گاگر کو تھاما اور چرخی پر لپٹی ہوئی رسی کو دوسرے ہاتھ سے اتارا۔ ایک دفعہ چوکسی اور ہم در بابے تیس فٹ گہرے کنوئیں میں جھانکا۔ اپنے شانوں کو جھٹکا دیا۔ جبڑوں کو بائیں گال کچھ کنوئیں سے گئے۔ لچھمن نے پھر غور سے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ ہتھیلی میں سے لکیریں اٹھ رہی تھیں۔ انگلیوں کے نیچے آج کچھ نئے نئے سرخ سے نشان بن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نشان آج دوپہر تک ابھرتے ہوئے ابدار ساں آبلے بن جائیں گے اور شہزادہ کی کھیر کھانے کے لئے اس کی انگلیاں یکجا نہ ہو سکیں گی۔ تاہم نصرت کی ایک ہلکی سی سرخی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

اس نے کاٹھ گودام کی ان بوڑھیوں کی طرف دیکھا اور ہانپتے ہوئے بولا:

"رام کالی..... آج شرادھ ہے کس کا؟"

نندو کی بہو آگے بڑھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھونگھٹ کو چوٹی کی طرف کھسکایا کہ لمبے پردے دھوتی کا پلو سرک گیا۔ اس نے احتیاط سے ایک پلو سینہ پر ڈالا اور لجاتی ہوئی بولی:

"میرے باوا کا..... اور کس کا ہوگا؟"

——اور پھر سب عورتیں لچھمن کی تعریف کرنے لگیں —— "بہت بہادر آدمی ہے لچھمن رام ٹھور ہے نا!" دوسری بولی "لچھمن کا بیاہ ہوگا۔ میں اس کی گھوڑی گاؤں گی۔ گھوڑی کی باگ تھاموں گی۔ جوڑا گاؤں میں اس کی ماں کے میکے ہیں۔ میری ماں کے میکے بھی جوڑا گاؤں میں تھے۔ میں لچھمن کی بہن ہوئی نا" اور ایک کہنے لگی "مجھے تو بھاوج کا رشتہ ہی پسند ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں سلائی ڈالوں گی۔ میری گاگر بھری تو کیا احسان کیا! دیور بھابیوں کے سینکڑوں کام کرتے ہیں" —— گوری بہو اچھڑے پوکھرنی سا ہاتھ نکلے گلابی سی سرخی ہو۔ بڑا مزا رہے گا۔ اس سال نہ بھی ہو تو جلدی کا ہے کی ہے۔ لچھمن بھائی کوئی بڈھا تھوڑے ہی ہو گیا ہے....."

——اور لچھمن کی عمر پچپن برس کی تھی۔ ستر سیر کی گاگر نکال چکنے کے بعد اس نے اپنے پھولتے ہوئے بازوؤں کی طرف دیکھا اور پھر کنکھیوں سے نندو کی بہو گوری کی طرف.....

کاٹھ گودام کے سب آدمیوں نے گوری کے حسن کی تعریف تو سنی تھی۔ مگر لچھمن کے سوا اسے کبھی پھر کر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر لچھمن کو یاد نہ رہا کہ اس کے اٹھتی پڑتی ہی بڑی بڑی مست نیم وا آنکھوں نے کرنے سے دھرے ہیں۔ اور وہ عورت جس کے بڈھا گھر میں تھا۔ اس کی ماں کو جب لچھمن کے باپ نے سالی کہا تھا تو اچھا خاصا کورو کشیتر ہو گیا تھا

اور اسی کنوئیں پر جب اس نے ایک دفعہ بھائی کا آنچل تھاما تو بھائی نے اس کی ناک توڑ دی تھی ..... وقت لچھمن نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی آنکھ بنتے دیکھا۔ جس میں گنتے گزرے بازو اجنگارتے ہوئے پازیب سرکتے ہوئے پلو اور نہ جانے کیا کچھ سما گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یکے بعد دیگرے تیس برس اس کے خلاف آہستہ آہستہ اس کے جسم پر سے اتر گئے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو پچیس برس کا نوجوان سمجھنے لگا۔

لچھمن نے سوچا۔ اول تو عورتیں بہادری کو پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں اس مادہ کا فقدان ہوتا ہے اور دوسرے وہ اس مرد کی طرف مائل ہوتی ہیں جو عورت کے سامنے مرد کی فطری کمزوری کو ظاہر نہ ہونے دے۔ دوسرے لفظوں میں محبت میں بس کر بھی اظہار تشنگی ہو۔ کیونکہ دوسری طرح بات کچھ عام سی ہو جاتی ہے۔ آج کنوئیں پر چھوٹی بڑی اس کی بہادری کا سکہ مان گئیں۔ آج تو وہ بالکل شہزادہ روپ ہو گیا تھا۔ تبھی تو سب رادھائیں اس کی طرف کھچی چلی آتی تھیں۔ مگر اس نے کمزور کم ظرف آدمی کی طرح ان کی طرف ضرورت سے زیادہ متوجہ ہو کر اپنے مردانہ وقار کو کم نہیں کیا اور ..... سترہ گاگریں اسر سنگھ کی بھاٹ نکل جائے۔ گوری تو ضرور اتنی بھی سوچتی ہوگی کہ میرا شوہر لچھمن کے مقابلہ میں کس قدر نالائق اور کمزور ہے ..... کاش! میں لچھمن کی رسی ہوتی۔ اگرچہ آج ان عورتوں میں سے ایک نے خود بخود بہن اور دوسری بھاوج بن گئی ہے۔ اس وقت لچھمن پل بھر کے لئے بھی یہ نہ سوچ سکا کہ کورو کشیتر کس طرح بپا ہوا تھا اور اس کی ناک کیوں توڑ دی گئی تھی۔ لچھمن نے نہ جانا کہ وہ کھلی کھلی سی آوازیں صرف گاگریں نکالنے کی فضیلت ہیں۔ اگر گھونگھٹ کو ذرا سا بھٹیا کی طرف سرکا دینے سے نہ ہو سکے لئے سارا پانی مل جاتا ہے تو کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے۔ عورتیں اپنی آنکھوں کی ہیرا پھیری سے سینکڑوں کام سدھ کر لیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سترہ گاؤں میں تو کیلی گوری کے حسن کی جھلک کی قیمت ہے اور محض لوگ
کی قیمت ..... اور وہ مست آنکھیں ! ..... مگر نہ کون جانتا ہے اور کون دیکھتا ہے
گوری بھی ایک مایا ہے اور مایا ہی رہے گی !

کاٹھ گودام کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ لچھمن کو بابا کے نام سے پکارنا کتنا خطرناک کام ہے۔ لچھمن بڑی سے بڑی گالی برداشت کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ مگر بابا کا لفظ اس کے دماغی توازن کو مختل کر دیتا۔ بابا کے جواب میں "بابا" تیری ماں بابا" تیرا ابا بابا" اور اس قسم کی بدزبانی بکتا اور بڑے بڑے پتھر پھینکتا۔ وہ ابھی اپنے آپ کو چھوکرا کیوں سمجھتا تھا؟ اسے کھٹکا سا لگا رہتا تھا کہ اگر وہ بوڑھا ہو گیا تو کون اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے چلے گا؟ پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے بابا لچھمن..... بابا لچھمن کہہ کر تالیاں بجاتے۔ مگر وہ اپنے تجربہ کی خوفناکی و ہیبت سے واقف تھے۔ زور سے بابا کہہ چکنے کے بعد وہ کاٹھ گودام منڈی کی بوریوں کے پیچھے یا اس کی تنگ گلیوں میں غائب ہو جاتے۔

جب کوئی کہتا کہ مالک رام کے بیاہ کی تاریخ ۱۵ پھاگن مقرر ہوئی ہے تو لچھمن ایک اضطراب کے عالم میں سن بالٹی چھوڑ دیتا۔ اپنی لاٹھی کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹکتا اور کہتا:

"ہاں بھائی !..... ۱۵ پھاگن !"

دوسرا کہتا "ہاں بھائی..... ہم نے سنا ہے تو کیسے سنا ہے؟"

لیکن لوگ اسے خوش کرنا بھی جانتے تھے۔ کوئی کہتا "چچا! آج تو تیرے چہرے پر سولہ برس کے نوجوان کا روپ ہے۔ ارے بھائی! اور چاچی کو چھوکر کیا جوان ہو رہی ہے ایسی ہی

جوان ہے جیسے تم ہو۔ خوب میل ہے بڑا جوڑ ہے۔ اگر تم اسے حاصل کر سکو تو تمنا مزا ہے۔
لچھمن جوانی میں جس بے حیا اور اخلاقی سزائیں کاٹ چکا تھا۔ اس لئے وہ خاموشی سے
دو تین بار ردھیا کی بیٹی کا نام لیتا اور ذہن میں سینکڑوں بار ——— اٹھتے بیٹھتے کھاتے
پیتے ——— ردھیا کی بیٹی ..... ردھیا کی بیٹی ..... دہراتے جاتا۔ حتیٰ کہ اس کی داڑھی
میں کھجلی ہونے لگتی۔

کاٹھ گودام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ آٹھ نو سو کے لگ بھگ گھر ہوں گے۔ تحصیل سے
ایک کچا راستہ کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چند میل
جا کر ایک بڑے سے بڑ کے نیچے یک دم رک جاتا۔ عام طور پر مسافر وہاں پہنچ کر ششدر
رہ جاتے۔ انہیں یونہی دکھائی دیتا گویا راستہ اس سے آگے کہیں نہیں جاتا ہے گا یعنی باوجود
زمین کے گول ہونے کے کاٹھ گودام دنیا کا آخر سرا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بڑ کی بڑی
بڑی داڑھیوں میں سے ہو کر تین چھوٹی چھوٹی گلیاں گاؤں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ چند
خستہ حالت کچے مکانوں، ایک آدھ چھوٹی اینٹ کی عمارت جس میں بورڈ کا ایک پرائمری
سکول تھا، شاہ رحیم کی قبر اور کالا بھیرو کے مندر سے گزر گھوم کر تینوں گلیاں پھر گاؤں
کے مشرق کی طرف ایک کشادہ سی سڑک سے مل جاتی تھیں۔ کالا بھیرو کے مندر کے
قریب کالے کالے کتے گھومتے رہتے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے غصہ اور دانتوں سے
زہریلا لعاب ٹپکتا تھا۔ کالا بھیرو شیو مہاراج کے دوار گنے جاتے ہیں۔ ان کی رفاقت
میں ہمیشہ ایک سیاہ فام کتا رہا کرتا تھا۔ اس لئے کالا بھیرو مندر کے پجاری چیتھڑی ہوئی
لنگوٹیوں اور پیریوں وغیرہ سے سیاہ فام کتوں کی خوب تواضع کیا کرتے تھے۔ اس
قسم کے کتے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور سرکاری آدمیوں کو انہیں گھمانے

ڈالنے کی مجال نہ تھی۔ کتے مفت کی کھاتے تھے اور موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کاٹھ گودام میں داخل ہونے والے راستہ کے پاس بڑ کے ایک تنے کے نیچے لچھمن بیٹھا کرتا تھا۔ وہ تین کام کرتا تھا۔ اول تو ہر ناواقف مسافر کو کالا بھیرو والے راستہ سے گزرنے کی ہدایت کر کے کتوں سے بچاتا۔ دوسرے اسے اپنے کنوئیں کا شیریں اور مصفا پانی پلاتا اور تیسرے زندگی کا گزارہ کرنے کے لئے من کی رسیاں بانٹتا۔

کبھی کبھی کوئی انجان مسافر بڑ کے نیچے لچھمن کو چہرے سے درویش صورت پا کر نہایت تپاک سے پوچھتا "پانی پلاؤ گے بابا؟" تو لچھمن فوراً لاٹھی اٹھا لیتا اور کہتا "بیٹی کا رشتہ تو نہیں مانگتا جو مجھے بابا سمجھتے ہو۔ اسی کنوئیں سے اس دن ستر گاگریں پانی کی کھینچی تھیں۔ تمہارے گاؤں کی سب عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ سمجھتے کیا ہو۔ اس بات کو وشنو عطار جانتا ہے..... سارا محلہ جانتا ہے، گاؤں جانتا ہے....." اور کالا بھیرو کے تمام کتے مسافر پر چھوڑ دیتا۔ اس بیچارے کی خوب ہی آؤ بھگت ہوتی۔ سنی کہ وشنو عطار یا بازار کا کوئی اور دوکاندار مسافر کو اس کی غلطی سے آگاہ کر دیتا۔ اور اگر وہ اپنے گاؤں سے اس کے لئے کبھی میگھو، جنک دلاری یا روحیا کا رشتہ لا دینے کا خیال ظاہر کرتا تو اس کی مٹھی چاپی ہوتی۔ بستر بچھا بچھایا استراحت کے لئے مل جاتا اور لچھمن پوچھتا:

"گانجا لاؤں چاچا..... کالا بھیرو کا گانجا تو دور دور مشہور ہے۔ سبھی لوگ جانتے ہیں۔ تم نہیں جانتے ہو؟"

کبھی کبھی وشنو عطار کا کاٹھ گودام کی چھوٹی سی منڈی کے لوگ دور سے کسی مسافر کو آتا دیکھتے تو وہ کہتے لچھمن بھائی، دیکھو وہ کوئی تمہیں دیکھنے کے لئے آ رہا ہے شاید سیتا موہری کا باپ ہے۔ سیتا موہری جو ڈاکا گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے۔ بہت خوبصورت، ذرا

سنو رجاد۔ ہاں ایوں لچھمن پہلے تو کانجا کا کش لگاتے ہوئے کہتا ـــــ او بھائی ... لچھمن تو جتنی ہو اتنی اونچی اور ستا ہے ... مگر پھر فوراً ہی لچھمن اپنی دھوتی اور پٹکے کے بل درست کرنے لگ جاتا اور عطار کی دوکان پر دھو کر ٹنگی ہوئی قمیص پہن کر جلدی جلدی اس کے بٹن بند کر لیتا اور پھر باوجود نہایت ہوشیاری سے کام لینے کے اس کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگتی۔

دشنو عطار کی وساطت سے لچھمن کو کالا تیل مل گیا تھا۔ کم از کم لچھمن کو اس دوائی کا نام کالا تیل ہی بتایا گیا تھا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ برف کی طرح سپید داڑھی چند ہی لمحوں میں اگنے سے آنے والی گھٹا کی طرح کالی ہو جاتی تھی۔ لچھمن تو عطار کی حکمت کا سکہ مان گیا تھا۔ یہ دشنو ہی میں طاقت ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں پچپن برس کے بڈھے کو بیس برس کا جوان بنا دے۔ لچھمن نے اس کے عوض کتنی ہی سن کی رسیاں بانٹ کر دشنو کو سامان وغیرہ باندھنے کے لئے دی تھیں۔

دشنو کی دوکان پر کبھی گلقند کے لئے گلاب کا قوام پکایا جاتا اور کبھی عرق گاؤزبان نکالا جاتا۔ ہر روز کبھی دھلتی تھی کبھی کبھی بہت سے اپلوں کی آنچ میں کشتے مارے جاتے تھے اور کالے تیل کا غلام بنا ہوا لچھمن دشنو کے سینکڑوں کاموں کے علاوہ بھٹی میں آگ بھی جھونکا کرتا تھا۔

لچھمن تھوڑا بہت پڑھنا جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی حیرت سے دشنو کی دوکان میں رکھے ہوئے ڈبوں پر جلی قلم سے لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھتا۔ عقرقرحا، معجون سرکہ، خمیرہ ابریشم عناب والا، جوارش آملہ عنبری ... اس کے علاوہ اور بھی کئی بوتلیں تھیں کسی میں عرق بزنجاسف تھا اور کسی میں بادیان۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی شیشیاں پڑی تھیں جن میں کشتہ

سنگ لیشب شنگرف وغیرہ رکھے تھے۔ ان چھوٹی شیشیوں پر لچھمن کی نظریں جمی رہتی تھیں۔
چھٹے شرادھ کے دن لچھمن کو نندو کے ہاں پھر بلایا گیا۔ لچھمن نے کالا تیل ملا اور نندو کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گوری کی تصویر بجلی کی طرح کوند کوند جاتی تھی۔ اگرچہ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک آبلے دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح پڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مگر گوری کی موہنی مورت اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک پیدا کر رہی تھی۔
لچھمن نے ریشمی پٹکا باندھا۔ پیاسے کالا بھیرو کے ایک پروہت نے دیا تھا۔ پروہت جی کے جسم پر اپلے پھوٹ جانے پر لچھمن نے ان کی بڑی سیوا کی تھی۔ جیٹھ، ہاڑ اور ساون تین مہینے سردائی، ٹھنڈائی وغیرہ رگڑ کر پلائی تھی۔ پروہت کو وہ پٹکا ان کی کسی معتقد عورت نے دیا تھا۔ پروہت کے اردگرد عورتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اور عورتیں انہیں تھالیوں میں سیدھا اور نہ جانے کیا کیا بھینٹ کرتیں عقیدت ہی تو ہے۔
لچھمن نے پٹکا باندھا اور بڑے غرور سے دشنو کی دوکان کے شیشے میں اپنی پگڑی کو دیکھا۔ الماری میں لگے ہوئے شیشوں میں اسے اپنی شکل اور چنانچہ گدھے دکھائی دیئے۔ گدھے اس کی پیٹھ کی جانب کمہار کے برتنوں سے لدے جا رہے تھے۔ کاٹھ کو ہم کے نام برتن پک کر تحصیل میں بکتے تھے۔ اور وہ گدھے تحصیل ہی کو جا رہے تھے۔ عطار کی الماری کے شیشے میں لچھمن کو اپنا عکس بہت ہی دھندلا سا نظر آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود لچھمن جانتا تھا کہ یہ اس کا اپنا عکس ہے اور وہ قریب تر کھڑے ہوئے گدھے کا..... دشنو نے لچھمن کی تیاری کر لینے کی قوت کی بھی کھول کر داد دی۔
لچھمن نے گوری کے گھر جانے کے لئے قدم اٹھایا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم پر کوئلے ہی کوئلے دھر دیئے گئے ہوں۔ کچھ دیر

کے لئے ہاتھ کی جلن تو ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس کا سارا جسم ہی ایک بڑا سا ہاتھ بن گیا تھا۔ لچھمن اٹھا لڑکھڑایا، لیٹ گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کولہوں کی ہڈی پر ستر گاگریں ایک قطار میں رکھی ہوں۔ اس نے آنکھوں کو ملا۔ دکان کے اندر لگے ہوئے جالوں، بھڑ کے دو تین چھتوں اور ایک آدم سے لٹکتی ہوئی چھپکلی کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے ہوا کو ایک چھوٹی سی گالی دی۔ کیونکہ وہ اس کے پٹھے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

گدھوں پر مزید بوجھ لادا جا رہا تھا۔ کمہار نے چھ ماہ کے عرصہ میں چار پانچ سو برتن حقے کی چلمیں، راہٹوں کی ٹنڈیں بنا رکھی تھیں۔ پہیہ اور پاؤں دن رات چلتے رہتے تھے اور کمہار کے جھونپڑے سے گنگنانے، کھنکارنے، تھوکنے، حقے کی گڑگڑاہٹ اور ٹھپ ٹھپ کی آوازیں پیہم سنائی دیتی تھیں۔ گدھے تو بوجھ محسوس ہی نہیں کرتے تھے۔ گویا سارے کا سارا کانوں گرام اٹھا لیں گے۔ لچھمن نے دل میں کہا۔ یقیناً یہ گدھے مجھ سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں..... اگرچہ ستر گاگریں.....

اس وقت کمہار نے آواز دی "او گدھے کے بچے!"

لچھمن نے کہا۔ آخر وہ گدھے ہیں اور میں آدمی ہوں۔ اگر یہ بات اونچے کہی جاتی تو شاید وہ سنو ایک دفعہ پھر اس کی امتیاز کرنے والی غیر معمولی قوت کی داد دیتا ——— بازار میں ایک لڑکا جسے کھانسی کی شکایت تھی۔ بڑے مزے سے کھڑا پکوڑے کھا رہا تھا اور کھاتے جاتا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک نسبتاً چھوٹا لڑکا تھیس کا کف زمین میں ٹال کر چوس رہا تھا۔ کئی چھوکرے تھیلے سے منگوائی ہوئی برف کے گولوں پر لال لال شربت ڈالا کر انہیں چاٹ رہے تھے۔ گلی میں چند عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک کہتی تھی جب میرا چندو پیدا ہوا تھا اسی

دن ہماری گائے نے پھاڑ دیا۔ اور وشنو کپڑے والے سے پوچھ رہا تھا "کیوں بھائی! اس دفعہ اردو کبھی پر نہ جاؤ گے؟" چھوکروں نے لچھمن کو دیکھا تو اس کا حلیہ عجیب ہی بنا ہوا تھا۔ ان کا لڑکپن کاک کی طرح تیر کر سطح پر آ گیا۔ لٹکے چلائے "بابا لچھمن..... بابا لچھمن!"

لچھمن بوکھلا کر اٹھا چھت پر چیخا دوڑ کر لگانے لگے۔ دو تین بھڑیں بھنبھنانے لگیں چارپائی کے پائے سے لچھمن کا گھٹنا ٹکرایا۔ اسے ایک جھاسا چکر آیا لچھمن نے ہوا کو ایک گالی دی، چیخا اور رونے لگا۔

گوری عرصہ تک نئے لچھمن کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ اسے ایسے دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ لچھمن کے عجیب سے روپ کو دیکھ کر شرا وہ تو کیا اپنے پتروں تک کو بھول گئی ہے۔ بھیرو استھان کے پروہت بھی آئے ہوئے تھے۔ جب گوری ان کی تواضع کرتی تو لچھمن کے دل میں خلش سی محسوس ہوتی۔ پھر وہ اپنی کم ظرفی پہ اپنے آپ ہی کو کوستا۔ جب پروہت چلا گیا تو گوری نے گھونگھٹ چنیا کی طرف سرکا دیا۔ عورتیں بچوں، بچھڑوں اور بوڑھوں سے پردہ اٹھا دیتی ہیں اور اس نے لچھمن سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ لچھمن نے مشکوک نگاہوں سے گوری کو دیکھا۔ دل میں یہ فیصلہ کیا کہ محبت بھی تو کسی کو بے پردہ بنا دیتی ہے۔ گوری نزدیک آئی تو لچھمن نے یوں محسوس کیا۔ جیسے اس کے وجود کا اسے قطعی علم نہیں۔ اور جوں جوں وہ بے اعتنائی ظاہر کرتا۔ گوری کھنچی چلی آتی تھی۔ لیکن پھر سوچا کہ یہ سب کچھ کھچاؤ کالے تیل کی وجہ سے تھا۔

روٹی سے فارغ ہونے پر محلہ کی عورتیں لچھمن کے گرد ہو گئیں۔ گوری ان سب کی ترجمانی کر رہی تھی۔ بولی! سترہ گاگریں! بہن ہیں تو مان گئی لچھمن کو..... اپنے مرد تو بالکل کسی کام

کے نہیں۔ وہ گاگر میں اتنے گہرے کنوئیں سے نہ نکال سکیں۔ لچھمن رامٹھور ہے آدمی تھوڑے ہے..... ان کے بڑوں نے ہماری تمہاری لاج رکھی تھی۔ اب کل کی ہی بات ہے۔ کتنی آن والے تھے رامٹھورا"

لچھمن کا منکان تک سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ وہ عورت جس کے جوڑا گاؤں نہال تھے اور جس سے گاگر کی بہن کا رشتہ تھا۔ بولی: "میں تو بھابی کے آنے پر خوب رنگ رلیاں مناؤں گی۔ ناچوں گی..... گاؤں گی..... سنگری رین موہے سنگ جاگا۔ بھور بھئی تو بچھڑن لاگا..... اور بھابی کتنی خوش ہو گی!"

گاگر کی بھابی بولی: "میں نے تو اپنے لئے دیورانی ڈھونڈ بھی لی ہے۔ لچھمن کے کان کھڑے ہو گئے۔ جب بھابی نے کہا: مجھے تو اس کا نام بھی معلوم ہے۔ تو لچھمن بہت خوش ہوا۔ ضبط نہ کر سکا۔ بولا:

"کیا نام ہے بھابی! اس کا؟"

"نام بڑا سندر ہے۔"

"کہو کی بھی؟"

"ذرا مزاج کی سخت ہے۔"

"میں جو نرم ہوں۔"

"گوری بھی جانتی ہے۔"

"کوئی کہے گی بھی؟"

"کاڈو دیوی! گوری نے کہا۔

"کاؤ دیوی؟" لچھمن نے پوچھا۔ وہ دھنہ نام کو دہرایا اور ذہن میں سینکڑوں بار اس کا جاپ کیا۔ ستے کو اس کی داڑھی میں کھجلی ہونے لگی۔

گوری بولی "تم اعتبار نہیں کرتے تو میں کالا بھیرو کی سوگند لیتی ہوں۔ کاؤ دیوی سے بیاہ کروانے کا میرا ذمہ۔ سارا خرچ میں اپنی گرہ سے دوں گی۔"

اب لچھمن کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ شب و روز نند کے گھر کا طواف کرنے لگا۔ اس کے ذرا سے اشارے پر چھبیل چلا جاتا۔ کہاروں کے گدھوں سے زیادہ بوجھ اُٹھا لیتا۔ کالا بھیرو کے کتوں سے زیادہ شور مچاتا اور کالو گودام کے سنڈوتوں سے زیادہ کھاتا۔

اس دفعہ برسات میں گوری کے گھر کا پرنالہ اوپر کی منزل پر بند ہو گیا تھا۔ گوری نے لچھمن کو کہا کہ وہ نیچے پر چڑھ کر پرنالہ تو صاف کر دے۔ لچھمن نے کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا تو پرنالے میں ایک کتے کا پلّہ مرا پڑا تھا اور پلے کا سر پرنالے میں بے طور پھنس گیا تھا۔ اب پلّہ کالے رنگ کا تھا۔ اس کی عزت ملحوظ خاطر تھی۔ مار کاٹ کر باہر نکالنا کالا بھیرو کی بے عزتی کرنا تھا۔ مگر پلّہ نہ اوپر آتا تھا نہ نیچے جاتا تھا۔

لچھمن اپنے آپ میں ایک نئی جوانی پا رہا تھا۔ اور عنقریب ہی شادی کی خوشی میں اس نے جوان بننے کے لئے رشنو عطار کی کئی دوائیاں کھائیں۔ آج دوائی زیادہ کھا لینے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ اور اسے تمام جسم میں سے شعلے نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ جوش میں وہ سب کام کئے جاتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ سخت دھوپ میں چھجے پر بیٹھا پرنالے کو صاف کرتا رہا۔ نیچے سے چند بچوں اور عورتوں نے آوازیں دیں۔

"بابا..... بابا..... کاڈ دیوی آئی"

لچھمن نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ بچوں کو گالیاں دیں، کتے کے پلے کو دم سے پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ جھٹکے سے باہر نکل آیا۔ مگر ساتھ ہی لچھمن کو اس زور سے جھٹکا لگا کہ وہ اوپر کی منزل سے زمین پر آ رہا۔

سارے کا سارا کاٹھ گودام نندو کے گھر پل پڑا۔ لوگوں کو لچھمن کے یوں مجروح ہونے کا بہت افسوس تھا۔ خصوصاً جبکہ کاڈ دیوی سے اس کی شادی کا چرچا چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ نرم دل لوگوں نے بے چارے کی مصیبت پر آنسو بھی بہائے۔

شام کے قریب خبر ملی کہ چوٹ دوٹ کی اب کوئی بات نہیں رہی۔ لچھمن شادی کے لیے بالکل تیار ہے۔ آج شام کو اس کی شادی ہوگی۔ گگو کی بھابی تو کہتی تھی اتنی بھی جلدی کاہے کی ہے..... لچھمن کوئی بوڑھا تھوڑے ہی ہو گیا ہے؟"

شام کو باجا بجنے لگا۔ کاٹھ گودام کے بہت سے آدمی براتی بن کر شادی میں شامل ہوئے۔ لچھمن کو بہت اچھے پہناوے پہنائے گئے۔ سہرے باندھے گئے۔ وہ اور بھی جوان ہو گیا تھا۔ لوگوں نے شمشان میں ایک بڑے پرانے پیپل کے پیڑ تلے نوجوان لچھمن کو کھڑا کیا۔ ایک طرف سے آواز آئی "ہٹ جاؤ..... دلہن آ رہی ہے"..... ایک آدمی چکر لگا کر گھیرا ہوا لایا۔ پھر کڑے میں سے لکڑیاں اتار کر زمین پر چتا کی صورت میں چن دی گئیں۔ اوپر لچھمن کو رکھا اور آگ جلا دی..... یہ عجیب شادی تھی جس میں سب براتی رو رہے تھے۔ اور جب نندو کی بہو گدی نے کاڈ کی ان تمام لکڑیوں کا خرچ اپنی گرہ سے دیا تو اس کی چیخ ہی نکل گئی۔

ردِّ عمل

جلال کو بالآخر فرصت مل ہی گئی کہ وہ اپنی عیش و نشاط کی محفل کو چھوڑ اور رخصت ہو کر
رخصت لے کر اپنے گھر آتے ہوئے چچا کو اس کی درخواست پر ایک دفعہ دیکھ لے۔

ابھی ابھی تھوڑا سا مینہ برسا جو حبیب منزل کے سامنے پانی نشیب میں کھڑا ہو گیا۔ جس سے
گزرنے کے لیے ایک چھوٹی سی خندق پگڈنڈی رہ گئی۔ جلال نے اپنی پتلون کے پائنچے
کو احتیاط سے سنبھالتے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر قدم رکھتے اور خاموشی کی زبان میں اس
قلب کی وقعت کو غیر ضروری گردانتے ہوئے اپنے چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سکینہ، جلال کی چچازاد بہن نے دروازہ کھولا اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے جلال کی طرف
دیکھا۔ اور آنسو کا وہ قطرہ جو کہ پہلے آنکھ میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹپک پڑا۔ کچھ
حیرانی سے اس نے کہا:

"جلال! تم آ گئے... ابا جان کی امیدوں کے خلاف ـــــ وہ تمہیں ابھی ابھی یاد کر رہے تھے۔"

جلال نے بہن کی بات کو بے توجہی سے سنا۔ برآمدے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے نیم بوسیدہ ٹاٹ سے اپنے بوٹوں کو نہایت اطمینان سے رگڑ رگڑ کر کیچڑ سے پاک کیا۔ ایک عام دنیادار کی مانند جلال نے ظاہری اضطراب کا کوئی نشان چہرے پر پیدا نہ ہونے دیا۔ نہ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں گھبراہٹ سے پھیلیں۔ نہ اس کی رفتار میں خلاف معمول سرعت آئی۔ چھڑی کو اتار کر کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ برآمدے کے دائیں کونے کے دریچے میں جو گلی میں کھلتا تھا۔ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور اسے گلی میں پھینک دیا۔ سکینہ جو اپنی والدہ کو جلال کی آمد کی اطلاع دے کر آئی تھی بولی:

"جلال ـــــ تم ابھی یہیں ہو بھائی؟"

"چچا کس کمرے میں ہیں؟ یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں سکینہ؟"

"اس کمرے میں..... جس کے سامنے تم کھڑے ہو۔ جلال! جلدی پہنچو۔ تمہارے پہنچنے سے شاید ان کی مضمحل طبیعت کچھ بہل جائے۔"

جلال نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک پرانی سی سٹیتھوسکوپ تھی۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی کو لبوں تک لے جاتے ہوئے اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے داہنی طرف ہو لیا۔ وہاں سے اسے اپنے چچا حبیب احمد ادیب کا زرد چہرہ صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس پر تھکاوٹ کے آثار اچھی طرح سے نمایاں تھے۔ اس کا ہر ایک خط بوکسی نتیجہ خیز تجربہ زندگی

کی نشانی تھا۔ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے ان کی آنکھیں مکمل طور پر بند نہ تھیں۔ اور بے روشن، نیم وا آنکھوں کے رعشہ لیے پن کو دیکھ کر دل کو ایک وحشت سی محسوس ہوتی تھی۔

یہ ہے مدورو جھریوں والا، کل انچاس برس کا مفتی بوڑھا جس کی بابت ملک الشعراء نے کہا تھا کہ وہ مکمل آدمی ہے۔" جلال نے دل میں کہا، "کتنا بڑا خطاب دیا اس نے۔ مکمل آدمی ہونا کتنا بڑا امتیاز ہے۔ آج کون آدمی صحیح طور پر مکمل کہا جا سکتا ہے۔"

معاً ادیب نے آنکھیں کھولیں اور اپنا منہ بائیں طرف موڑا۔ سامنے جلال کھڑا تھا اس نے سلام کیا۔ لیکن ادیب نے صبر و سکون اور بے چینی کے مابین کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے ماتھے پر تیوری چڑھا کر آنکھیں بند کر لیں..... ان کے لب آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے۔ گویا ایک صدیوں سے آشنا، پُر حلاوت، جذبات سے لبریز ایک قسم کے ہسٹریکل (HYSTEHICAL) بوسے کے لئے مرتعش ہوں..... اور جیسے ان کی روح عریاں ہو کر قلب کی اندرون زیں ماہیتوں میں ایک ایسے ہلکے ہلکے میٹھے مدہوش کن صورت ازل اور ایک ایسی خنک سی تجلی کی متلاشی ہو جو اس مقام ہو کی عمیق بے کراں تاریکیوں میں اس کے لئے شمع بردار ہو جائے اور اس کی رہنمائی کی وجہ سے وصل تمام ممکن.....

جلال نے اپنے بائیں طرف ادیب کی تصنیف کردہ کتابوں پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالی۔ الماری کے پاس ہی اخروٹ کی لکڑی کا ایک وحشت پہلو میز دھرا تھا۔ اس میں کہیں کہیں سپید گلکاری کی ہوئی تھی۔ میز کے اوپر قلم دوات، چائے کی ایک پیالی اور ایک دھجی کیا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ جلال نے کاغذ کو اٹھا کر پڑھ لیا۔ لکھا تھا:

بوڑھے کے آنسو چار سو بکھرے پڑے تھے
اس نے حاری عمر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا تھا۔
بوڑھے نے سر اٹھایا اور کہا ——
زندگی کے اسباب بکھرے پڑے ہیں،
نئی معشوق کی مسکراہٹوں کی مانند،
کسی غریب کے دل کی جمعیت کی مانند،
صرف ایک سبق رہ گیا ہے —— پشیمانی کا،
—— اے موت! وہ بھی سکھا دے،

"حبیب"

جلال کی طبیعت پریشان سی ہو گئی۔ وہ بے پروا ضرور تھا۔ مگر ایک لطیف ذہن اور ایک حساس دل کا مالک تھا۔ اس کے مزاج کی مستقل دیوار متزلزل ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کئی زرد، سرخ، مبہم سے حلقے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر اس کی آنکھوں کے پاس کن پٹی سے چھو کر، انواع و اقسام کی اقلیدسی اشکال پیدا کرتے ہوئے فضا میں دور تک پھیل رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ ایک غلجان سا پیدا ہوا۔ ایک غنودگی یا نیم غشی کی سی حالت میں اس کے قلب میں یک لخت ایک تحریک، ایک زبردست سی رو پیدا ہوئی اور اس نے چاہا کہ وہ اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی پیالی کو اوندھا کر دے۔ بے مطلب، لاحاصل خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ جلال نہ جان سکا۔ وہ صرف اس بات سے واقف تھا کہ ایک اندرونی طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے دل کے ساتھ تصفیہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز پیالی کو اوندھا کرنے کے فضول خیال کو عملی جامہ نہیں پہنائے گا۔

بلکہ اس قسم کے خیال پیدا ہونے پر اس نے اپنی کمزور طبیعت کو کوسا لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ جب تک وہ پیالی کو اوندھا نہ کرے گا۔ اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ــــ مشکل، ناممکن..... اور سب کے دیکھتے ہوئے اس نے پیالی کو اوندھا کر دیا۔ تھوڑی سی چائے میز پر سے بہتی ہوئی فرش پر گر گئی۔ سب حیرت سے جلال کی طرف دیکھنے لگے..... اس کے فوراً بعد ہی اسی قسم کا خیال پیدا ہوا کہ وہ رو دے۔ اس وقت جلال نے اپنی ذہنی تحریک کے خلاف جانا بالکل بے سود سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب ذرا سا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اندرونی حکم کے تابع کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا.....

فعل عیش و انبساط سے نکل کر اس فوری اور وہ کرب کی فضا میں جہاں قہقہوں کی بجائے آنسو، جوانی کی بجائے بڑھاپا، ناکردہ گناہوں کی پشیمانی، موت گھوم رہے ہوں، اس کا جی نہ لگا۔ جلال نے ایک عجیب انداز سے شانے جھٹکائے۔ سگریٹ جلاتے ہوئے سگریٹ کی راکھ کو چٹکی سے گرایا اور دل میں کہا کہ کہیں سگریٹ کو باہر پھینک دینے کا خیال اس کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے۔ وہ کانپ اٹھا۔ برقی رو کے سے بیشتر جلال ایڑیوں کے بل چلتا ہوا کھڑکی میں پہنچا اور سگریٹ کو باہر پھینک دیا۔ دور..... بہت دور جتنی دور اس سے ممکن تھا۔ اور روکھی سی مسکراہٹ لبوں تک لاتے ہوئے سوچنے لگا۔ بھلا ایک مکمل آدمی، محض ایک معمولی سی پشیمانی کی خاطر موت کو دعوت دیتا ہے۔ ناگاہ اسے یاد آیا کہ اسی نوعیت کا ایک اور خیال بھی چچا نے اپنی کتاب "رنگ و آہنگ" میں ظاہر کیا تھا کہ انسان اس قدر خود سر اور خود بیں ہے کہ اس پر آسمان کی گردش سے جتنی بھی بلائیں نازل ہو سکتی ہیں یکے نازل ہو جائیں تو بھی انسان خود کردہ فعل کو غلطی یا گناہ کہنے اور صحیح طور پر پشیمان ہونے کی بجائے

پھر باتوں سے دل کی تسلی کے سامان بہم پہنچائے گا۔ وہ ہر وقت بچپن کے گناہوں کو طفلانہ پن، جوانی کے گناہوں کو جوانی نادانی پر اور بڑھاپے کے گناہوں کو انسانی ناتوانی اور کمزوری کے سر تھپے گا۔ حتیٰ کہ حد سے زیادہ دیر ہو جائے گی اور موت اپنے تلخ جام کے ساتھ اس کے ہر رگ و ریشہ میں پشیمانی کا سبق سرایت کر دے گی۔ ایک عمیق اور تنقیدی نظر اپنی مختصر سی زندگی پر ڈالتے ہوئے جلال نے کہا: کس قدر درست بات ہے ——— برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ..... قیامت کب کسی نے دیکھی ہے ..... یہی دن تو ہیں ..... اور اس کے اس قسم کے سینکڑوں کلمات اب تک ایتھر میں لہروں کی صورت گھوم رہے ہوں گے۔

"میں جلال سے کچھ کہنا چاہتا ہوں" دفعتہً جلال کے چچا نے بہت نحیف آواز سے کہا۔ اور نہایت آرام و سکون سے اپنی آنکھیں اس طرف پھیر لیں۔ جلال تیزی سے چچا کی چارپائی کے نزدیک دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"سکینہ ——— سامنا دروازہ تو کھول دو ——— مجھ تک ہوا آنے دو" ادیب نے پھر کہا۔

ایک لمحہ کے لئے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سکینہ نے دروازہ کھولا۔ ٹھنڈی ہوا ایکدم فراٹے سے اندر داخل ہوئی ..... سب نے ادیب کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"باہر بارش اچھی ہو گئی ہے نا؟"

"جی چچا جان! ..... کافی برس گیا، پانی"

اور اپنی دھندلی آنکھوں میں سے باہر دیکھتے ہوئے ادیب بولا:

"دنیا کس قدر وسیع ہے ..... رنگین اور بے رنگ بھی ———"

"جی ہاں ..... بہت وسیع ہے۔ رنگین اور بے رنگ بھی" جلال نے چچا کے تخیل

کی رَو کو سرعت سے بدلتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے دہرایا۔ ادیب کے اس طور باہر دیکھنے پر سب لوگ باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر کچھ بھی نہ تھا۔ صرف سخت سردی میں ایک اندھا لاٹھی ٹٹولتا ہوا جا رہا تھا۔ جلال نے چچا کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ چچا کچھ کہنے کو تھے مگر قوتِ ارادی کی ناتوانی کی وجہ سے کہہ نہ سکے۔ جلال نے دیکھا دوبارہ حد سے زیادہ زور لگاتے ہوئے چچا نے کہا:

"دیکھو جلال بیٹا..... باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستہ پر نشیب و فراز دو تو ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔"

——— ایسے معلوم ہوا جیسے یہ بات کہتے ہیں ادیب نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ہو۔ ان کو دو ہچکیاں سی آئیں اور اس سے پہلے کہ فضا میں بڑبڑ کی آوازیں لرزش پیدا کر دیں ان کا جسم ساکت ہو گیا اور برف کی مانند ٹھنڈا۔

چچا حبیب احمد کو کفنانے دفنانے کے بعد واپس لوٹتے ہوئے جلال ایک لرزہ خیز سا محسوس کرتا ہوا بازار کی رونق میں سے گزر رہا تھا۔ بیتیس برس کی عمر میں خود کو چچا کے مقابلے پر لاتے ہوئے وہ اپنے آپ کو زیادہ معمر محسوس کرنے لگا۔ اور شاید زیادہ تجربہ کار۔ لیکن اس کے خیال میں تلافی مافات کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی ——— بہت دیر..... اور وہ مفردات جو کہ انسان کی بہتری کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اپنی تخریب سے بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ یکایک اس کے رونگٹے کھڑے ہونے شروع ہو گئے اور اسے کانوں میں سائیں سائیں اور نفس کی نوع بہ نوع موافق اور ناموافق سی آوازوں کے درمیان چچا کے آخری الفاظ گونجتے سنائی دیتے ——— "باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستے پر نشیب و فراز

دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تاہم اسے چنداں فکر نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے۔"

"کیا یہ الفاظ کسی تشبیہ مجازی کے حامل تھے یا یونہی ایک گزرتے ہوئے نابینا کو دیکھ کر ایک علیل دماغ کی واہی تباہی ——؟" جلال نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر جلال نے سوچا، بچا استاد استعارہ مانے جاتے تھے اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ اپنے حواس کی موجودگی میں وہ الفاظ انہوں نے بے معنی طور پر اور اتفاقاً کہے ہوں گے..... پھر اس نے اپنی تمام تر علمیت جو کہ اب گزرے ہوئے زمانہ کی ایک حسین یادگار رہ گئی تھی طلب کیا۔ اور دل ہی دل میں ان الفاظ کی تفسیر و تشریح کرنی شروع کی۔

خوانچے والوں کی آوازیں، اخبار بیچنے والوں کا شور و غوغا، سینما والوں کے بانگ بل اعلان، ریڈیو کلینک کی دکان کے اندر ایلیلی فائر کی مدد سے بلند ہوتا ہوا گانا، خوب صورت نیو ماڈل کاروں کے ہارن، اس کے کانوں میں جگہ پانے سے قاصر رہے۔ اس کے پاس ہی سے ایک مونگے رنگ کی ٹاچ سیڈان گزری۔ جس کو ایک مونگے رنگ کی وردی کا شوفر چلا رہا تھا۔ کار کے اندر ایک نازنین اسی رنگ کی ایک کریپ کی نہایت خوش نما ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ گزرتے ہوئے لوگ رنگ کی اس مشابہت و مطابقت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ جلال جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کی آخری سیٹوں کو دیکھا کرتا تھا اس نے صرف ایک نظر سے اس کار میں دیکھا۔ اس کے فوراً بعد ہی اس کی نظر چند بھک منگوں کی طرف چلی گئی اور اس نے محسوس کیا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "دنیا کس قدر وسیع ہے، رنگین اور بے رنگ بھی ——" اور جلال زمین پر نظریں گاڑے ہوئے وہاں سے گزر گیا۔

رٹز ریسٹوران کے خانساماں نے اپنے گاہک جلال کو اپنے کیبن کے نزدیک رکتے ہوئے دیکھ کر کہا، "حضور را پیرس سے بیئر کے دو دورے سمو سے آئے ہیں۔ شاہین سے

ان کا خاص ....."

جلال نے ایک سخت نگاہ سے خانساماں کی طرف دیکھا اور کہا: "پیچھے ہٹ جاؤ۔ نامعقول" اور خود آگے بڑھ گیا۔

"چچا آخر کتنا سادہ آدمی تھا" جلال نے سوچا اور نفس کش، صحیح معنوں میں کفایت شعار خرچ کرنے کی جگہ خرچ کرنے والا۔ خاموش، سنجیدہ مزاج مگر بولنے کی جگہ جوشیلا مقرر..... حقیقت دا صلاح کے لئے قدرت کی مثبت و منفی دونوں طاقتوں کا استعمال کرنے والا ـــ آخر وہ مکمل آدمی تھا۔

ـــ ایک دفعہ پھر اس کے کانوں میں ادیب کے آخری الفاظ گذرے۔ جس طرح تمام روئے زمین پر پھیل چکنے کے بعد ایتھر میں پھر ایک معین وقفہ کے بعد لہر آتی ہے ـــ "باہر ایک اندھا جا رہا ہے۔ اس کے راستہ پر نشیب و فراز دونوں ہیں جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا مگر اسے چنداں فکر لازم نہیں۔ اس کے پاس لاٹھی ہے"

تمام پریشانیوں سے اپنی توجہ کو یک سو راغب کرتے ہوئے اب جلال نے مرحوم چچا کے آخری الفاظ کی تفسیر کرنی شروع کی۔ یکایک اس کے گالوں پر ایک ہلکی ہلکی سرخی جو شفق پر سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے یا حجلۂ عروسی میں پہلی مرتبہ متقابل جنس کے بازوؤں میں مستغرق ہونے سے دلہن کے چہرے پر ہویدا ہوتی ہے نمودار ہوتے تھی اور ایک تلخ سی مسکراہٹ جو دوشیزگی کے وقار کو کھونے کے باوجود پیدا ہوتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اس نے کہا:

"آخر کتنا عمیق تھا چچا کا مطالعہ۔ انسان کی زندگی کے غیر ضروری ناقابل توجہ واقعات سے وہ روزانہ سبق لیتے تھے۔ زندگی کی ہر لطیف جنبش سے انہوں نے کچھ نہ کچھ اخذ کیا حتیٰ کہ موت سے پشیمانی، اس کی تفسیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے مستقبل یعنی زندگی

کے نشیب و فراز اور اونچے نیچے راستہ پر ایک بے خبری کے عالم میں جا رہا ہے کیونکہ وہ ہونے والے واقعات سے آگاہ نہیں۔ وہ اونچی نیچی جگہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ جس طرح اندھا آدمی اپنی لاٹھی کی مدد سے اپنا راستہ نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ وغیرہ میں سے نکال لیتا ہے، اس طرح آدمی اپنی دور اندیشی کی لاٹھی سے اپنی زندگی کو بے خطر اور استوار بنا سکتا ہے۔ جس اندھے کے پاس لاٹھی اور جس انسان کے پاس دور اندیشی نہیں وہ دنیا کے نشیب و فراز، پانی اور کیچڑ میں منہ کے بل گرے گا

جلال نے کلائی پر سے چیسٹر کی آستین ہٹاتے ہوئے وقت دیکھا ساڑھے سات بجے تھے اور سردیوں میں ساڑھے سات بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ دھندلے سورج کے غروب ہوتے ہی تمام شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا..... اور یہ بلیرڈ کلب میں جانے کا وقت تھا۔

بلیرڈ کلب، سموکنگ کلب، پریل کلب یہ سب ایک ہی بات تھی۔ یہ سب مہذب مرد عورتوں کی تفریح گاہیں تھیں۔ جلال نے اپنی جیب ٹٹولی۔ پرسوں کی سویپ اور پریل میں اس نے تہتر روپے جیتے تھے۔ جلال کو وہ کھیل سی محسوس ہونے لگی جو ہر ایک جیتے ہوئے کھلاڑی کو اور داؤ لگا کر سب کچھ گنوا دینے کے لئے اکساتی ہے۔ جلال ایک دم رک گیا۔ چیسٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے فیصلہ کن اقرار دعویٰ سے کہا کہ وہ یقیناً ان روپوں کو کسی بہتر کام میں صرف کرے گا۔ وہ اپنی بھولی بسری بیوی کے لئے گرم ساڑھی لائے گا یا اپنے بڑے بیٹے کے لئے جو ایک مقامی کالج میں ایل اے کا متعلم تھا۔ ایک چھوٹی سی لائبریری خرید دے گا۔ وہ نظارہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ جبکہ اس کے بیٹے نے نہایت اشتیاق سے کتابیں خرید کر لا دینے کی التجا میں انگلستان کے بڑے بڑے پبلشر

انگیز رہے پر گن ڈالے تھے

آج پھر جلال نے اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ تمام گذشتہ وقت جوانی کا بیش قیمت زمانہ اس نے عیش و نشاط کی محفلوں، مہذب بدمعاشوں کی صحبتوں، طوطا چشم ایکٹرسوں کو طول وطویل چٹھیاں لکھ کر ان کی تصاویر منگوانے میں گزارا تھا اور خود کو اس اندھے کی مانند بنا دیا جس کے پاس لاٹھی نہ ہو اور جسے ہر طرح کا فکر لازم ہو اور اب بھی وہ زندگی کے نشیب و فراز میں دور اندیشی کی لاٹھی کے بغیر بھاگا جا رہا تھا اور وہ بھی بے تحاشا!

اس نے بازار میں گذرتے ہوئے تمام آدمیوں کو دیکھ کر انسانی فطرت کے مطابق اپنے دل کو تسلی دینی شروع کی۔

"ان میں سے کسی کے پاس لاٹھی نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی سنبھلا ہوا ہے بھی تو وہ شخص ہے جو کہ لاٹھی کے بہ ہوتے ہوئے بے تحاشا نہیں بھاگتا۔ بلکہ استقلال سے قدم بہ قدم چل رہا ہے۔"

"مجھے کم از کم بے تحاشا نہیں بھاگنا چاہئے۔" جلال نے دل ہی دل میں خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا کہ دو خوبصورت استعارے کے زیر اثر خود بھی سست پڑ گیا ہے۔ اس کی رفتار ایک عام کاروباری آدمی کی رفتار سے بہت کم ہو گئی تھی۔ جلال نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اور تیز چلتے ہوئے اس نے قدرے اونچی آواز سے کہا:

"اپنی وہ لاٹھی جو میں نے گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھی ہے اور جس کی ہستی کو بھی بھول چکا ہوں محنت اور کاوش سے ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے استعمال کیا کروں گا۔"

شہر کے قارنانے کی شکل پیگوڈا سے مشابہت رکھتی تھی۔ بنگال کے ایک اعلیٰ کاریگر نے اسے بنایا تھا۔ اس کے چاروں طرف پینتالیس سیڑھیاں تھیں اور صبح و شام شہر کے لوگ سمندر سے

آنے والی ہر اسے لطف اندوز ہونے کے لئے وہاں جمع ہو جاتے۔ شراب کے متعلق ملک کے اس حصے کا قانون سخت گیر ہونے کی وجہ سے کئی شخص پینے کے بعد ایک سیڑھی پر بازو رکھ کر اسے تکیے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بائی کا جسم نچلی سیڑھی پر رکھے پڑے رہتے تھے۔ جس طرح کسی بڑے دریا کے ریتلے کناروں پر گھڑیال دھوپ تاپنے کے لئے پاؤں پھیلا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ جلال حسب معمول ان انسان نما گھڑیالوں یا گھڑیال نما انسانوں سے بچتا بچاتا تار خانے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھی بو دو دن سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نہایت خلوص سے اسے ملے۔ مگر جلال دردِ سر کا بہانہ کر کے ان سے معذرت کا خواہاں ہوا اور ایک آرام کرسی میں دھنس گیا۔

جلال صبح سے بھوکا تھا اور حالت گرسنگی میں آدمی لطیف سے لطیف خیالات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جلال جس کا پیٹ طرح طرح کے کھانوں کے علاوہ حرص و ہوا سے تنا رہتا تھا۔ آج اس قابل تھا کہ اسے دور کی سوجھ سکے۔ اور وہ گذشتہ زندگی اور روزمرہ کے واقعات کا تصور کر کے پریشان و پشیمان ہو۔ بظاہر اس کی آنکھیں قارہ باندوں کے سر پہ لٹکی ہوئی قندیل پہ جمی ہوئی تھیں مگر دراصل وہ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں تھا۔ اسے مس میگی کا گھر دکھائی دیا۔ مس میگی شروع شروع میں ایک بورژوئین سوسائٹی گرل تھی اور ایک بڑے بلند مرتبت خاندان کی چشم و چراغ۔ اسے پینٹنگ (PAINTING) کی لت پڑ گئی۔ بک میکرز نے اسے خوب لوٹا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو بیچنے لگی اور اب اس کے ہاں امیر آدمیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

تصور میں جلال نے اپنے آپ کو میگی کے دروازے پر کھڑا پایا۔ اسے دیکھتے ہی دو دھڑی دوڑی اسے لینے کے لئے دروازے تک آئی۔ کیونکہ جلال مس میگی کا مستقل مالدار قدردان

گاہک تھا۔ میگی نے اسی انداز سے جو شکایت سے تھی نہ تھی۔ پوچھا:

"تم گذشتہ دو شب کہاں رہے جلال؟ ..... تمہاری طبیعت مضمحل نظر آتی ہے کچھ؟"

ایک اور سرو قد بت تھا جو کہ میگی کے مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ بت قدرے دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس بت کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یکایک اس بت نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے۔ وہ بت جلال کی بھولی بسری بیوی تھی۔ جلال نے اپنی بیوی اور مس میگی کے استفسار کا مقابلہ کیا۔ بیوی اسے اسی کے لئے چاہتی تھی۔ اور کبھی کبھی شکایت کے آنسو گراتے ہوئے پوچھتی ـــ "میں کہتی ہوں ..... آپ دو رات کہاں رہے۔ میں یہاں اکیلی تڑپتی رہی ہوں" اور وہ آواز مطلق تصنع اور ناز و انداز کی حامل نہ تھی۔ بلکہ دل ہی سے دماغ سے مشورہ لئے بغیر اس کے خیالات لبوں تک آجاتے۔ لیکن میگی جلال کو جلال کے لئے نہیں اس کی جیب کے لئے چاہتی تھی جو عموماً نہیں بلکہ ہمیشہ خالی ہوتی تھی۔

"فیاڈے ..... اس دفعہ پھر ہار گیا جلال ـــ فیاڈے ہار گیا" میگی نے جلال کو تاسف سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے ہارنا ہی چاہئے ..... " جلال نے جواب دیا اور پھر بولا "میرے عزیز چچا حبیب احمد کل فوت ہو گئے ہیں ....." اس وقت اس کی رحم طلب نگاہیں وہاں بیٹھے ہوئے دو ایک آدمیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ تمام نے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک نے یہ بھی محسوس کیا کہ جلال نے عیش و نشاط کے موقع پر یہاں آکر اپنی افسردگی سے تمام انجمن کو افسردہ کر کے اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔

میگی نے کئی ایک باتوں سے جلال کو تسلی دینی شروع کی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس کے نہ آنے سے

کتنی بجلیاں تھیں جو اس پر کوندیں۔ اور کتنے وسوسے تھے جو اس کے دل میں آئے.....

جوں جوں وہ یورپین لڑکی خوشامد کرتی تھی توں توں جلال کا دل اس سے متنفر ہوتا ——

اس نے ایک انتھا اپنی جیب پر رکھ لیا۔ جس کو بچانے کا صرف آج کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ میگی کے پیش کردہ ہاتھ کو پرے دھکیلتے ہوئے ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ سے جلال نے کہا: "تمہیں ایک خبر سناؤں میگی..... چچا اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ میرے نام چھوڑ گئے ہیں۔"

"سچ؟" میگی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ یہ بات صحیح معنوں میں اس کے لئے دلخوش کن اور دلنواز تھی۔ وہ اپنی خوشی کو فریب نظر کے دامن میں مستور نہ کر سکی۔ اگرچہ یہ اس کے پیشے کی خصوصیت ہوتی ہے اور وہ چھپاتی بھی کیسے؟ جب کہ جلال کی نظر نہایت باریک بین ہو گئی تھی۔ اور اس وقت وہ فولاد کے آر پار بھی دیکھ سکتی تھی۔

"علاوہ اور چیزوں کے چچا مجھے ایک لاٹھی دے گئے ہیں —— تاکہ میں ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ بنا لوں اور نشیب و فراز میں نہ گروں۔" جلال نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔

"کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو جلال..... لو پی کے بے نیاز ہو جاؤ۔" مگر میگی نے سمجھا کہ یہ صرف چچا کی موت کا گہرا اثر ہے۔ جلال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تمہارا شباب زوروں پر ہے....."

میگی نے اپنے جسم پر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی اور مسکرائی۔

"کل ڈھل جائے گا۔"

مس میگی نے دوسری دفعہ اپنے جسم کی طرف دیکھا اور خون اس کے رخساروں اور کانوں کی طرف دوڑنے لگا۔

تم بوڑھی ہو جاؤ گی اور پھر تمہیں کوئی نہ پوچھے گا..... یہ جتنے بھی بیٹھے ہیں اور میں خود بھی ——" اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہارے شباب کے خریدار ہیں۔ جوانی کی شام ہونے پر یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروندوں میں جا گھسیں گے۔ تم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ پھر تم کیا کرو گی؟"

"یہ سوال تو میں عنقریب ہی تم سے کرتی..... کیا تم اس وقت میری خبر گیری نہ کرو گے؟"

"ایسا نہیں ہوا کرتا بیگی! شباب کی رعنائیوں کے خریدار عمر کے ساتھ بوڑھی ہونے والی رعنائیوں کی کھوٹے داموں بھی قیمت ادا نہیں کرتے۔ اگر تم پیٹنگ میں تباہ ہونے کے فوراً بعد ہی شوہر کر لیتیں تو گو زندگی ظاہرا طور پر عیش سے نہ گزرتی تب بھی تمہارا انجام خراب نہ ہوتا۔ عورت سے وابستہ وہ آدمی جسے شوہر کہتے ہیں، اپنے بڑھاپے میں معمر بیوی کی بوڑھی اور بھونڈی رعنائیوں کی بھی وہی قیمت ادا کرتا ہے جو اس نے جوانی میں ادا کی ہو گی —— بلکہ اس سے بھی زیادہ —— میں نے تمہارے شباب کو عزیز کیا ہے اور اس کے لطف کو خریدا ہے۔ مگر بیوی نے بغیر دام لئے اپنے جام خلوص اور ایثار سے مجھے پلا دیئے۔ اس لئے وہی ایک ہستی ہے جو میرے جذبۂ ایثار پر تسلط جمانے کا حق رکھتی ہے.....

..... بیگی! تم اس اندھے کی مانند ہو جو کہ سے تماشا بھاگا جا رہا ہو۔ حالانکہ اس کے پاس لاٹھی بھی نہیں۔ تم نے اپنی لاٹھی یہیں کہیں گھر کے کسی کونے میں بھول کر ڈال دی ہے۔ نکلو۔ اسے ڈھونڈ نکالو اور اس سے اپنے مستقبل میں اپنی راہ نشیب و فراز اور کچھ سے بچ کر نکال لو۔ ورنہ رنج و الم کی گہرائیوں میں جا گرو گی ——"

جلال کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آخری الفاظ نہایت زور سے کہے تھے۔ قہوہ خانے کے سب آدمی جلال کی طرف گھور رہے تھے۔ جلال کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے دبے ہی اونچی آواز

میں کہا:

"یہ میرے ادیب چچا کے آخری الفاظ ہیں اور تم سب لاٹھی کے بغیر ہو جو بالضرور مصائب کی خندق میں اوندھے منہ گرو گے ـــــ"

ـــــ دوسرے لمحہ میں جلال پگوڈا نما قارخانے کی پینتالیس سیڑھیوں کو بے تحاشا پھلانگتا ہوا جا رہا تھا اور اسے اپنے پیچھے بے تحاشا، دیوانہ وار قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

موت کا راز

اس بے ربط و ناہموار زمین کے شمال کی طرف نباتاتی ٹیلوں کے دامن میں، میں نے گندم کی بتیسویں فصل لگائی تھی اور سرطانی سورج کی حیات کش تمازت میں لکتی ہوئی بالیوں کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا۔ گندم کا ایک ایک دانہ پہاڑی دیمک کے برابر تھا۔ ایک خوشے کو مسل کر میں نے ایک دانہ نکالا۔ وہ کناروں کی طرف سے باہر کو ذرا سے پچکا ہوا تھا۔ اس کی درمیانی لکیر کچھ گہری تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گندم اچھی ہے۔ اس میں خوردنی مادہ زیادہ ہے اور گھوڑ کھیوڑ کی منڈی میں اس سال اس کی فروخت نفع بخش ہوگی۔

میرے خیالات کچھ یکسوئی اختیار کر رہے تھے۔ اس وقت زندوں میں سے میرے نزدیک کوئی نہ تھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر زندوں میں سے کوئی تمہارے نزدیک نہ تھا تو پھر مردوں کی یاد تمہارے ویران خانۂ دل کو آباد کر رہی تھی؟ ——— میرا جواب اثبات میں ہے۔

میں آپ سے ایک اور بات بھی اصرار سے منوانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں مُردوں کا تصور ہی نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان کو اپنے سامنے، پیچھے، دائیں اور بائیں کتھاکلی انداز سے رقص کرتے، ہنستے اور خوف سے کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جس طرح آپ کی داڑھی کا بال بال مجھے علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور آپ کی ذہانت زدہ آنکھوں کے سُرخ ڈورے دیکھ رہا ہوں اسی طرح میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کا چہرہ جموں سوتیا کی اس کلی کی مانند جس کا چہرہ صبح کے وقت کاشمیری بہار کی شبنم نے دھو دیا ہو، شگفتہ ہو کر چمک رہا تھا اور کسی کے چہرے پر جھریاں اور گہری گہری لکیریں تھیں۔ شاید وہ کسی تلخ خیز تجربۂ زندگی کی نشانیاں تھیں۔

نہ وہ گندم کے کھیت کے کنارے پھیل رہے تھے، نہ ہی تیس سالہ شیشم جس کے گھنے سایہ دار پھیلاؤ کے نیچے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا ..... اپنے ہلکے ہلکے پاؤں کو پھیلا رہے تھے۔ بلکہ وہ خود میرے جسم کے اندر تھے ..... ہائیں! آپ حیران کیوں کھڑے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ میں کہاں تھا؟ ..... سنئے تو ..... میں جسم کی اس حالت میں تھا جسے انہماک کی آخری منزل کہنا چاہیئے۔ میں خود اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر اسے بول دیکھ رہا تھا جس طرح پرانی حکایتوں کا شہزادہ، کسی اونچے اور جاتاتی ٹیلے پر کھڑا دور سے اس شہزادی کے محل کا اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے وجود سے اندازہ لگائے جس نے اپنی شادی مشروط رکھی ہو۔

دو فصاں، خنداں، لرزاں لوگ۔ میرے بزرگ تھے ..... بچہ اپنے والدین کی تصویر ہوتا ہے، میرا باپ اپنے باپ کی تصویر تھا۔ اس لئے میں اپنے دادا کی تصویر بھی ہو سکتا ہوں۔ اور یوں ارتقائی منازل طے کرنے کی وجہ سے اپنے بزرگانِ سلف کی اگر صاف نہیں

تو دھندلی سی تصویر ضرور ہوں ..... ہندوستانی تہذیب دو نسلوں سے شروع ہے ایک دراوڑ اور دوسری آریہ۔ میں آریہ نسل سے ہوں۔ میرا قد، سفید رنگ، سیاہ چشم، حساس، خوش باش اور قدرے وہم پرست ہونا اس بات کا ثبوت ہے ——— یہ بات معلوم کرنے کی میری زبردست خواہش تھی کہ موت کا راز کیا ہے۔ مرتے وقت مرنے والے پر کیا کیا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مجھے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ مادہ اور روح لافانی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ موت کے عمل میں اپنی ہیئت بدلتے ہیں تو اس وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے ——— آخر مرنے والے گئے کہاں؟ وہ جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ وہ کوئی دوسری شکل اختیار کر لیں، جسے ہم لوگ آواگون کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف ہیئات میں ظہور پذیر ہونے کے بعد پھر اس ذرہ کو جس سے ہم پیدا ہوتے ہیں، آدمی کی شکل دی جاتی ہے۔

یہ بات سن کر شاید آپ بہت ہی متعجب ہوں گے کہ میں اپنے سامنے اپنی پیدا ہونے والی ولادت کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ایک گھنگھریالے سیاہ بالوں اور چمکتے ہوئے رخساروں والا لحیم شحیم بچہ آیا جو آج سے ہزاروں سال بعد پیدا ہوگا اور جو میری ایک دھندلی سی تصویر تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور چھاتی سے لگا بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ اسے پیار کرتے وقت مجھے فقط یہی محسوس ہوا جیسے میں اپنا داہنا ہاتھ بائیں کندھے اور بایاں ہاتھ داہنے کندھے پر رکھ کر اپنے آپ کو بھینچ رہا ہوں۔ اس بچے نے کہا:

"بڑے بابا ..... پرنام ..... میں جا رہا ہوں۔"

میرا ہونے والا بچہ اور بزرگان سلف تمام واپس جا رہے تھے۔ اس انہماک کے عالم میں، میں ابھی تک دور کھڑا ہی محسوس کر رہا تھا کہ میرا جسم زمین کا ایک ایسا حصہ

ہے جس میں ہمیں بزرگانِ سلف کی تاریں اور آئندہ نسلوں کے شاندار عمل ہیں جن میں رسول کے ذریعے اور نئے آنے والے اپنے قدیم اور جدید طریقوں سے جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔

..... گھبرائیے نہیں اور سنئے تو..... یہ میری باتیں جو بظاہر پاگلوں کی سی کہانی دیتی ہیں، دراصل ہیں بڑی محنت خیز..... مجھے کچھ سمجھا لینے دو ——— پھر میں آپ کو اپنی مضمون میں تشبیہ دینے کا طریقہ بتاؤں گا۔ کل ہی آپ کہہ رہے تھے کہ دخانوں پر گدھ شام کے وقت بیٹھے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی اُلّو کے پنجے شیشم پر سنہری تیوز اُلّو سے لٹک رہے ہوں ——— کتنی بھونڈی تشبیہ کہی آپ نے!.....

یہ تو ہمیں جانتا ہی ہے کہ روح کے علاوہ مادہ بھی فنا نہیں ہوتا۔ مگر اس بات کو دیکھنے کی ایک آگ سی ہر وقت سینہ میں سلگتی رہتی تھی کہ موت کے عالم میں، بظاہر فنا ہوتے ہوئے شخص یعنی ذرے کی مجموعی صورت کو کن کن تخریبی و تعمیری مدارج سے گذر کر دوسری ہیئت میں آنا پڑتا ہے..... یعنی..... آخر..... موت کا راز کیا ہے؟

وہ ذرۂ عظیم، وہ جزو لاینجزی، جو کہ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مغز ہے، کیسا منظم ہے۔ مثال کے طور پر اجرامِ فلکی کی گردش کا نظام لیجئے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی جرم اپنے مخصوص راستہ سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹ جائے تو کیسی قیامت بپا ہو۔ چاند گرہن کے موقع پر ہم لوگ وان چُن بھی کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہی ایک ایسا وقت ہو سکتا ہے جبکہ اجرامِ فلکی کا کشش ثقل سے اِدھر اُدھر ہو کر اور آپس میں ٹکرا کر مادۂ ہیولیٰ کی شکل اختیار کر لینا ممکن ہے۔ ہم آریہ ——— ہماس، من موجی اور توہم پرست لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ہم کوئی برا کام کرتے ہوئے تباہ ہو جائیں۔ اور وہ مادہ ہیولیٰ کا ایک حصہ بن جائیں وان چُن

سے اچھا کام اور کیا ہوگا؟

..... آپ اسے تصوف، وہم اور خشک اور ترش مضمون کہیں۔ مگر یہ ان ہر اقسام سے بالاتر ہے۔ ہاں ہاں! آپ نے پوچھا تھا کہ ذرہ عظیم کیا ہے ——— یہ جاندار شے کی ابتدائی صورت ہے۔ یہ عورت اور مرد دونوں میں زندہ ہے۔ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مرکز ہے۔ شاید اس سے بہتر اس کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق میں ایک قیاس غیر مصدق جو بظاہر یاوہ گوئی دکھائی دیتا ہے مگر ہے بہت جامع اور درست ——— دہرا دینا چاہتا ہوں۔ وہ قیاس غیر مصدق ریاضی طبیعیات کے ایک بڑے ماہر[1] نے کہا تھا:

"ذرہ ..... جزو لاینجزیٰ ..... ہم نہیں جانتے کیا ..... کیا کچھ کرتا ہے ——— ہم نہیں جانتے کیسے! .....؟ ....!"

"شاید ریاضی دانوں نے ریاضی قواعد ضرب و تقسیم اس وقت سے ہی سیکھے ہیں۔ وہ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے چوگنا ہو جاتا ہے ..... اور پھر ہزاروں سے حیران کن طور پر ایک ..... یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ بیج سے وہ ہو جاتا ہے مگر اس بات سے پردہ راز نہیں اٹھا کہ وہ کیسے؟ جس دن یہ پردہ راز اٹھے گا تو موت کا راز منکشف ہونے میں باقی نہ رہی کیا جائے گا؟

چند دن ہوئے میں اسی اضطراب ذہنی میں مبتلا بیٹھا تھا اور سرطانی سورج گندم کی بالیوں کو پکا رہا تھا۔ بالیاں بالکل سوکھ چکی تھیں اور ان کی داڑھی اس قدر خشک ہو گئی تھی کہ ایک ایک

(1. Eddington — Inkis Gifford Lectures)

بال کانٹے کی مانند چبھتا تھا، کچھ دبانے سے بال خود بخود بھڑنے لگتے۔ سٹے کو مسلتے مسلتے اس کا ایک بال میرے ناخن میں اتر گیا اور لاکھوں ذرات جن کی میں مجموعی صورت ہوں۔ ان میں سے ایک ذرّے کو جو کہ انفرادی طور پر ذرّہ عظیم سے کم نہیں، اس نے آگے دھکیل دیا، وہ ذرّہ جو آگے دھکیلا گیا نامعلوم گذشتہ زمانے میں میرا کوئی بزرگ تھا، یا شاید آئندہ نسلوں میں سے کوئی ——— یہ میں جان نہ سکا، بہر حال سٹے کا بال ان دونوں میں سے نہ تھا، وہ ایک بیرونی خارجی چیز تھی جس کو میرے نظام جسم میں چلے آنا اس مسافر کی مداخلت بے جا کی مانند تھا، بہ لفظ "شارع عام نہیں ہے" پڑھتے ہوئے بھی اندر گھس آئے۔ یہ قطعی ممانعت کی وجہ ہی تھی کہ درد کی ٹیس اٹھ اٹھ کر مجھے لرزہ براندام کر رہی تھی ———

بھلا ایک کتا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آنے دیتا، تو میرے قابل پرستش بزرگوں اور معرکۃ الآرا کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان ہستیاں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب برداشت کر سکتی تھیں۔ اُف درد! ماسوا اس چیز کے ——— اس ذرّے کے جو کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی اور جسمانی بنت بننے، یا ہمارے بزرگوں سے ہمیں ورثہ میں آئے۔ کسی اور چیز کو مطلق دخل نہیں۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں پاتے جب تک خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سہہ کر جسم سے باہر نہیں پھینک دیا جاتا۔

وہ ذرّہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے غلط روی سے اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلوک اور ناتواں بنا دیا ہے تو آپ کے وہ ذرّے جنہوں نے آپ کے بیٹے اور پوتے بننا ہے۔ مفلوک اور ناتواں حالت میں آپ کے سامنے آکر آپ کے دلی اور ذہنی اضطراب کا باعث ہوں گے۔ وہ اپنے قسمت و مقدر

کہیں گے۔ لیکن اگر قسمت کی تعریف مجھ سے پوچھیں تو وہ یہ ہے۔ صحبت و نیک و بد کے اثر کے علاوہ جو چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں نے ہمیں دی ہے وہ ہماری قسمت ہے" اس لئے آپ جو بھی فعل کریں، سوچ کر کریں۔ انگلی بھی ہلائیں تو سوچ کر..... یاد رکھئے۔ یہ ایک معمولی بات نہیں ہے..... اب شاید آپ ذرّے کے قول و فعل سے کچھ واقف ہو گئے ہوں گے۔

جس دن سٹے کا بال میرے ناخن میں داخل ہوا میں بہت مضطرب رہا ——— شام کو میں گھبرایا ہوا قریب ہی شہر کے ایک بڑے اختر شناس کے پاس گیا۔ اس نے میری راس وغیرہ دیکھتے ہوئے قیافہ لگایا اور مجھے کہا کہ ہر مہیت کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو کہ درازیٔ عمر کی پیشین گوئی سن کر یہ مالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں چمکتی ہوئی طلائی انگوٹھی اتار کر دے گا۔ مگر یہ بات سن کر مجھے سخت بے چینی ہوئی۔ مایوسی کے عالم میں میں نے اسے اس کی تعلیل فیس ——— ایک ناریل، آٹا اور پانچ پیسے دے دئے..... میں تو نہ چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی شوق تھا کہ میں اس راز کو، جس کی بابت بڑے بڑے حکیم اور طبعیات کے ماہر کہہ چکے ہیں ——— "وہ کرتا ہے کچھ..... ہم نہیں جانتے کیسے....." طشت از بام کر دوں، اور دنیا میں پہلا شخص ہوں جو کہ دوسری ہیئت میں آتے ہوئے اپنی حیرت انگیز یادداشت کے ذریعہ سے دنیا پر واضح کر دے کہ ذرّے کو یہ حالت پیش آتی ہے ——— اور وہ اس شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔

اس بات کے مشاہدہ کے لئے خود مرنا لازمی تھا مگر عاقل اختر شناس نے اس کے برعکس درازی عمر کی روح فرسا خبر سنائی تھی، آتم گھات، خودکشی ایک پاپ تھا جس کا ارتکاب نہ صرف میرے بزرگوں کے نام پر دھبہ لگاتا تھا، بلکہ موجودہ بچوں اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا تھا، چنانچہ میں نے خودکشی کے خیال کو بالکل باطل گردانا۔

میں جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا، وہاں سے دریائے گنڈک کے کسی معاون کے ایک آبشار کی آواز صاف طور پر کانوں میں آ رہی تھی اور چونکہ مجھے وہی بات خوش کر سکتی تھی جو کہ میرے دل کو مضطرب کرے۔ اس لئے گنڈک کے معاون کے آبشار کی دل کو بٹھا دینے والی آواز مجھے بھا رہی تھی، ایک پتھر کو اٹھاتے ہوئے میں نے بہت سے کیڑے مکوڑے دیکھے۔ پھر میں نے کہا:

"شاید اس آبشار کی آواز اور موت کے راگ میں کچھ مشابہت ہو ——" شام ہو چکی تھی، سورج مکمل طور پر ڈوبا بھی نہیں تھا۔ کہ سر پر چاند کا سے نور اور کاغذی رنگ کا جسم دکھائی دینے لگا۔ پتھروں میں سے ایک جلا دینے والی بھڑاس نکل رہی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا، ایک ترکیب سوجھی جس سے میں ذرے کی ہیئت بدلنے کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ یعنی موت کا عمل بھانپ سکتا تھا۔ اسے ہم خودکشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف مشاہدہ کی آخری منزل ہے۔ وہ یہ —— کہ گنڈک کے معاون کے آبشار سے آدھ میل بہاؤ کی طرف جہاں پانی کی خوفناک لہریں ایک پتھریلے ٹیلے کو عمود ٹکرا کر اپنا دم توڑتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف گنڈک سے ملنے کے لئے نکلتی ہیں، نہانے کے لئے اتر جاؤں اور غیر ارادی طور پر پانی کے اندر ہی اندر گہرائی اور تیز بہاؤ کی طرف آہستہ آہستہ چلتا جاؤں اور یہ صورت پیدا ہو کہ یا میرا پاؤں کسی آبی جھاڑی میں الجھ جائے یا کوئی بہانور مجھے کھینچ لے یا پانی کا کوئی

زبردست ریلا رہ عمل میرے سامنے لے آئے جس سے ذرہ کو کوئی دوسری صورت ملے ——— شاید آپ اسے بھی خودکشی کہیں۔ مگر اس غیر ارادی فعل کو میں ترقدتی موت کہوں گا۔

چنانچہ مرنے سے بہت پہلے میں نے اپنے تصور میں کنکھل ——— گنگا مائی کے چرنوں پر سر رکھا اور سوگندی کہ میں ضرور اس غیر ارادی فعل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔

گنڈک کی سماون آبشار سے ایک ریل بہاؤ کی طرف بھی پانی اسی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا باوجودیکہ عموداً چٹان سے ٹکراتے ہوئے اس کی لہریں اپنا دم توڑ چکی تھیں۔

میں کمر تک مکتی ناتھ اور دھولاگری کے اردگرد کی پہاڑیوں سے آتے ہوئے برفانی پانی میں داخل ہو چکا تھا۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھنا چاہتا تھا کیونکہ ایسا کرنا ارادتاً اپنے آپ کو مار ڈالنا تھا۔ کچھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ پاؤں کو اقلیدسی نصف دائرہ کی شکل میں گھمانا شروع کیا اور تقریباً پانچ منٹ تک ایسا کرتا رہا تاکہ پانی کا کوئی ریلا مجھے بہا نہ لے جائے۔ یا کوئی تیندوا یا گھڑیال پانی میں ٹانگ پکڑ کر مجھے گھسیٹ نہ لے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

..... معاً میرا پاؤں ایک آبی جھاڑی میں الجھ گیا اور میں پانی میں غوطے کھانے لگا۔ میرا پاؤں پھسلا اور دوسرے لمحہ میں پانی کے ریلے بڑے زور شور سے میرے سر سے گذر رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو میں نے اپنا دم حاد صدکھا۔ مگر کب تک؟ بے ہوش ہونے سے پہلے

مجھے چند ایک باتیں یاد تھیں کہ میری ٹانگیں اور ہاتھ تیز پانی میں کانپتے ہوئے ادھر ادھر چل رہے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے سانس سے چند بلبلے اٹھ کر سطح کی طرف گئے۔ میرے دماغ میں زندہ رہنے کی ایک زبردست خواہش نے اکسا ہٹ پیدا کی۔ اس کوشش میں میں کسی چیز کو پکڑنے کے لئے پانی میں ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر اب میں پانی کی زد سے باہر نہ آسکتا تھا۔ اگرچہ میں نے اس کے لئے بہت کچھ جدوجہد کی۔

اس کے بعد میری یادداشت مختل ہونے لگی..... میرے بزرگان..... کنکھل..... پرانی حکایتوں کا شہزادہ..... موت کا راز..... مکتی نا تھ..... کنکھل..... موت کا راز..... اس کے بعد ایک نیلا سا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی ایک جھلک ایک بڑے سے کیڑے کی شکل میں دکھائی دیتی..... پھر پرانی حکایتوں کا شہزادہ..... ذرّہ..... موت کا عمل.... خاموشی اور اندھیرا ہی اندھیرا!

اس مکمل بے ہوشی میں مجھے ایک نقطہ سا دکھائی دیا جو کہ برابر پھیلتا گیا۔ شاید یہ وہی ذرّۂ عظیم تھا جس کی بابت میں نے بہت کچھ کہا ہے جو بسیط ہوتا گیا۔ وہ پھیل کر ایک جھلی کی سی صورت میں میرے جسم کے اردگرد لپٹ گیا۔ اس طرح کہ اب پانی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی خلا میں ہوں۔ جہاں سانس لینا بھی ایک تکلف ہے۔

ذرّۂ عظیم سے آواز آنے لگی:

"موت کے عمل میں تین حالتیں ہوتی ہیں قبل از موت، موت، بعد از موت۔ قول حالت میں ہو سکتا ہے کہ دوسری حالت تم پر طاری ہونے سے پہلے تم زندہ رہ جاؤ۔ قدرتاً اس میں

تمہیں دوسری حالت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ دوسری حالت میں تم اس بات کو ایک عارضی عرصہ کے لئے جان سکتے ہو جس کی تم اتنی خواہش لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا اظہار نہیں کر سکتے مابعد موت تمہیں زندگی کی پہلی نشانی گویائی قوت عطا کی جاتی ہے۔ پھر یادداشت کو جو اول دوم حالت میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ ذرّے کو فراموشی عطا کر کے اس پر مہربانی کی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے آدمی کر غیب سے ناآشنا رکو کر اس پر کرم کیا جاتا ہے ——— وہ راز یادداشت کی مکمل تحلیل میں پنہاں ہے۔"

"یادداشت کی مکمل تحلیل" میں نے ان الفاظ کو ذہن میں دہراتے ہوئے کہا "یادداشت کی تحلیل ——— کیا ہماری نسلیں بھی ہماری یادداشت ہیں؟ ..... اور کیا اس کی مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے سامنے طشت از بام کر سکتا ہوں؟ ..... میں زندہ رہنا چاہتا ہوں"۔

——— زندگی کی اس خواہش کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو مکتی ناتھ اور وطلاگری کے ابد گرو کی پہاڑیوں میں سے بہ کر آتے ہوئے برفانی پانی کی سطح پر پایا۔ جھلی سی میرے جسم پر سے اتر چکی تھی۔ زندگی کی ایک اور خواہش کے پیدا ہوتے ہی گنڈک کے معاون کے ایک ریلے نے مجھے کنارے پر پھینک دیا۔ اس وقت چاندنی رات میں ہوا تیزی سے چل کر سانس کی صورت میں میرے ایک ایک مسام میں داخل ہو رہی تھی۔